ماہنامہ نمود لاہور

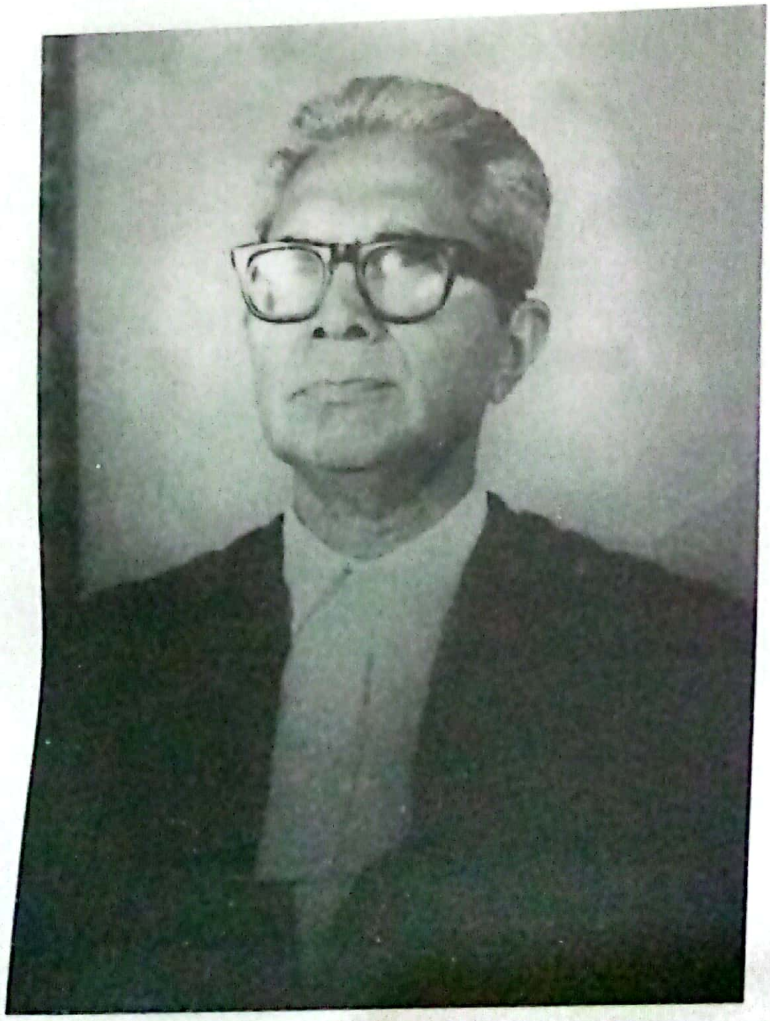


مدیر: قائم نقوی

Scanned with CamScanner



اکبر لاہوری اپنے خاندان کے ہمراہ



اکبر لاہوری

Scanned with CamScanner

ماہنامہ نمود لاہور

مدیر

قائم نقوی

☆☆☆☆

جلد 2 شمارہ 8-9

☆☆☆☆

اگست، ستمبر 2014ء

☆☆☆☆

فی شمارہ -/60روپے

بمہ ڈاک خرچ -/100روپے

بیرون ممالک -/10ڈالر

☆☆☆☆

زرِسالانہ بمہ ڈاک خرچ -/600روپے

بیرون ممالک -/60ڈالر

☆☆☆☆

ٹیلی فون: 042-35974195

03015253177:

03314822964:

ای میل

namood.qaimnaqvi@gmail.com

پتہ: 56۔کوچہ سیف الملوک، سلیم سٹریٹ، چھپڑ سٹاپ، ملتان روڈ، لاہور

قائم نقوی نے نقوی برادرز پرنٹرز دربار مارکیٹ لاہور سے چھپوا کر چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ سے شائع کیا۔

Scanned with CamScanner

فہرست

نعت	ظفر الحق چشتی، کامران ناشط	3
افسانے		
سانپ گھر	محمود احمد قاضی	4
قاسو نمبردار	محمود عالی	7
نمرود کے شہر میں تفریق کی گھڑی	لطیف ساحل	15
رضیہ سلطانہ	نصیر اعظم	20
شاہ محمد کا تانگہ	علی اکبر ناطق	25
نظمیں		
زاہد مسعود		36
حسن کاظمی		37
ڈاکٹر اکرم عتیق		38
شازیہ محمود		39
فن اور فنکار		
ابوالحسن یمین الدین	راشد جاوید احمد	40
ملکہ غزل فریدہ خانم	پروفیسر سلیم الرحمٰن	45
یادِ رفتگان		
اکبر لاہوری	ناصر زیدی	60
ابوالطاہر فدا حسین فدا	عمران نقوی	66
غزلیں		
مشکور حسین یاد، ناصر زیدی		74
شفیق سلیمی، ظفر الحق چشتی		75
محمد علی ظاہر		76
مرتضیٰ ساجد، فرح محمود		77
نقد و نظر		
ن م راشد کی نظموں کے انگریزی تراجم	ڈاکٹر محمد نوید ازہر	78

Scanned with CamScanner

کامران ناشطؔ

نعت

نعت ہی مسلک مرا، میرا قبیلہ نعت ہے
دوجہانوں میں مرا واحد وسیلہ نعت ہے

ماں سے سوتے جاگتے بس نعت کی لوری سُنی
سو کسی بھی حال میں اپنا اثاثہ نعت ہے

بے سرو سامانیوں میں اطمینان قلب ہے!
دوستو میں سچ کہوں میرا خزانہ نعت ہے

مُجھ سے جو پوچھو کتابِ نور کی تفہیم کا!
اس کی منشا نعت ہے اس کا خلاصہ نعت ہے

ان کی نسبت سے مری تعظیم بھی تکریم بھی
کیوں نہ پھر ناشطؔ کہوں میرا حوالہ نعت ہے

☆.....☆☆☆.....☆

ظفرالحق چشتی

نعت

عشق جامی نہیں بے تابیِ حسانؓ، نہیں
نعتِ سرکارؐ میں لب کھولنا آسان نہیں

سوزِ صدیقؓ و عمرؓ بھی مرے سینے میں نہیں
میں بلالؓ و قرنیؓ ، بوزرؓ و سلمانؓ نہیں

مجھ کو نسبت بھی نہیں اُستنِ حنانہ سے
میں تریٰؐ قصویٰ کے قدموں کے بھی شایان نہیں

مجھ سے بڑھ کر ہیں مُقدر میں اُحد کے پتھر
حیف اِس ہونے پہ میں بدر کا میدان نہیں

زندگی جیسی بھی تھی حُبِ علیؓ میں گزری
للہ الحمد کہ دل میرا پشیمان نہیں

مُہرِ تصدیق علیؓ کی نہ لگے تو کوئی
شاہِ بغداد نہیں، ہند کا سلطان نہیں

تیرے حسنینؓ کی اُلفت کا ثمر خُلدِ بریں
اُنؓ سے جو دور ہٹا صاحبِ ایمان نہیں

کیسے میں دعویٰ کروں اُنؓ کی غلامی کا ظفرؔ
میرے دامن میں تو ایسا سرو سامان نہیں

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

سانپ گھر

محمود احمد قاضی

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور گلی کلاں اپنی پراسرار خاموشی میں ڈوبی گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ جھینگروں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ اپنے نغمے الاپنے لگے تھے۔ میں اپنے منشی خانے میں راکنگ چیئر پر بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس وقت میں ہی اس گلی کا شاید واحد شخص تھا جو کہ جاگ رہا تھا۔ مجھے سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادت تھی اور یہ عادت ایسی تھی کہ مجھے اس کے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے چوبارے کی بالکونی سے جھانکتے چاند کو دیکھا۔ اس کی چاندنی کی ٹھنڈک میں بھی ایک پراسراریت تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے چاند مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں تو ۱۹۳۵ء میں شائع ہونے والے نقشِ چغتائی کے مصور ایڈیشن میں کھویا ہوا تھا۔ جہاں مصور مشرق کی اقلیدی اشکال، لکیرین، خطوط، قوسیں اور کولائیاں مجھے لبھا رہی تھیں تو وہیں اپنے وقت کے اس بہترین ایچر کی اس کتاب کی نوک پلک سنوارنے والے عمدہ خطاط محمد اسد اللہ کی کاوش بھی مجھے محور کر رہی تھی۔ میری یہ محویت شاید ابھی اور کچھ دیر تک طاری رہتی کہ ایک ہلکے سے آوازے نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک کراہ تھی۔ آہ تھی جو اب سسکی میں بدل رہی تھی۔ تو ڑی ہی دیر میں اس سسکی کا تسلسل اسے ایک ہلکی چیخ اور پھر چیخوں میں بدلنے لگا۔ ان نسوانی چیخوں میں ایک پکار تھی۔ میں نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور بالکونی کی طرف بڑھ آیا۔ جس وقت میں نے گلی میں جھانکا۔ اس وقت تک اکا دکا گھر کا دروازہ یا کھڑکی کھٹاک سے کھلنے لگی تھی۔ پھر کافی تعداد میں لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باہر آ گئے۔ مجھے احساس تھا کہ خواتین اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد اس وقت اپنے گھروں کی کھڑکیوں کے ساتھ لگی کھڑی ہو گئی۔ یہ نسوانی چیخیں رئیس احمد باردانے والے کے گھر سے برآمد ہو رہی تھیں۔ ان کی آواز اب کافی بلند ہو چکی تھی۔ میں ننگے پاؤں تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتا ہوا اپنے گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر آنے کا جتن کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ میرے اہل خانہ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے نہایت بے زاری کے ساتھ بیدار ہو رہے تھے۔ باہر لوگوں کا ایک ہجوم

Scanned with CamScanner

تھا۔ رئیس احمد باردانے والے کے گھر کا دروازہ کھلوالیا گیا اور چند بزرگ اور معتمر لوگ رئیس احمد کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ رئیس احمد خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ گھبراہٹ میں کسی کی بات کا صحیح طور پر جواب نہ دے رہا تھا۔ وہ کہے جا رہا تھا۔ ''بچی شاید خواب میں ڈر گئی ہے'' لڑکی مسلسل سانپ سانپ کئے جا رہی تھی۔ وہ ڈری اور سہمی ہوئی ایک طرف اشارہ کئے جا رہی تھی۔ لوگ اُس کوٹھری میں گھس گئے۔ وہ وہاں تقریباً آدھ گھنٹے تک رہے۔ انہوں نے وہاں کی چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جب کہ لڑکی بیان کے مطابق وہ سوئی ہوئی تھی اچانک اس نے دیکھا کہ ایک کالا ناگ اس کوٹھری سے نکل کر اس کی چارپائی کی نزدیک آیا اور پھر اپنا پھن پھیلا کر لہرانے لگا تھا۔ لڑکی کے مطابق اسے یہ بات قطعی طور پر معلوم نہیں تھی کہ یہ واقعہ اس نے حقیقت میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا کہ یہ ایک خواب تھا۔ بہر حال لوگ متعجب سے ہوئے وہاں سے نکلے اور اپنے گھروں کو سدھار گئے۔ چند عورتیں البتہ لڑکی کے پاس مزید کچھ دیر کے لئے رک گئی تھیں۔ وہ اسے دلاسا دیتی رہیں۔ پھر وہ بھی چلی آئیں۔ دوسرے دن ہر گھر کا موضوع یہی رات کا واقع تھا۔ ان کے نزدیک یہ لڑکی کا وہم تھا۔ کچھ کے نزدیک یہ اس کا خواب ہی تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یعنی یہ کہ اس واقع کا حقیقت سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لڑکی چونکہ باپ کے ساتھ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہ رہی تھی۔ اس لئے اس گھر کی اداسی اور تنہائی نے اس ہیولے کو جنم دے ڈالا تھا۔ اُن کے نزدیک اس کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس گھر میں کچھ عرصہ پہلے ایک سپیرا اپنے کنبے کے ساتھ رہ چکا تھا۔ سانپ ہر وقت اس کے گھر میں ادھر ادھر آوارہ پھرتے رہتے تھے۔ تھے تو وہ بے ضرر لیکن ہر کوئی اُنہیں دیکھ کر ڈرتا تھا۔ اُن سے کرایت محسوس کرتا تھا۔ ان سانپوں کی وجہ سے اس گھر میں ایک عجیب قسم کی ناگواری بُو ہر وقت پھیلی رہتی تھی۔ یہ سپیرا جنگلوں سے سانپ پکڑ کر لاتا تھا اور انہیں مختلف اداروں اور اشخاص کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ وہاں پر اس سانپوں کے زہر سے سانپ کاٹنے کا تریاق تیار ہوتا تھا۔ اس شخص کا تو یہ پیشہ تھا لیکن گلی کے لوگ اس کے اس فعل قبیح سے بہت تنگ تھے۔ وہ اسے یہاں سے کہیں اور منتقل ہونے کے لئے بہت دفعہ کہہ چکے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں اور اس سانپ گھر کا رخ نہ کرنے کا کہتی تھیں۔ ایک دن وہ سپیرا لوگوں کی بات مان کر ادھر سے چلا گیا۔ تب سے رئیس احمد باردرنے والا اپنی جوان بچی شازیہ کے ساتھ یہاں منتقل ہوا تھا۔ اس وقت سے یہ لوگ آرام اور سکون سے زندگی گزار رہے تھے کہ اب اچانک یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ شاید یہ اُس سپیرے کے سانپوں کی پرچھائیں تھی جو اب لڑکی کو ڈرا رہی تھی اور جس کی وجہ سے گلی بھر میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خود رئیس احمد الگ سے پریشان تھا۔ وہ صبح کو کام پر نکلتا تھا اور شام گہری ہونے پر واپس ہوتا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ لڑکی اب تقریباً ہر رات کو اپنی چیخوں سے سب کو پریشان کرنے لگی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ہی لفظ ہوتا تھا۔ سانپ، سانپ، لڑکی نے اب اس بیان کو پکا کر لیا تھا کہ جو کچھ وہ ہر رات کو دیکھتی تھی یہ کوئی خواب نہ تھا بلکہ حقیقت تھی۔ سانپ واقعی اپنا ایک وجود رکھتا تھا۔ ویسے اس کے نزدیک یہ کوئی ضرر رساں سانپ نہ تھا۔ میں خود بھی اس دلچسپ مگر چند کتب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک دو بار میں نے لڑکی کے اس کیس کو split personality کا کیس بھی سمجھ لیا تھا۔ لیکن پھر جلد ہی میں نے اپنے اس

Scanned with CamScanner

خیال سے چھٹکارا حاصل کرلیا تھا۔ میرے حساب سے یہ کچھ اور ہی تھا۔ حقیقت میں خواب یا خواب ملی حقیقت۔ گلی البتہ متضاد آرا میں بٹ چکی تھی۔ کچھ کے خیال میں لڑکی فراڈ کر رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کو دھوکہ دے رہی تھی۔ وہ کوئی چکر چلا رہی تھی۔ دوسری رائے رکھنے والے لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھی کہ لڑکی کی پہ کسی قسم کا سایہ تھا۔ کئی کے نزدیک اس پر جن آ گیا تھا۔ چنانچہ دم درود والے اور جھاڑ پھونک والے بلائے جانے لگے۔ تعویز دھاگے والوں کا بھی تانتا بندھ گیا۔ مگر کوئی بدلاؤ نہ آیا۔ لڑکی کی چیخیں بدستور جاری تھیں۔ رئیس احمد اب شام کے وقت جب گھر آتا تو شرمندہ سا ہو کر اپنی نظریں نیچی کیے ہوئے گلی مین سے گزرتا۔ وہ لوگوں سے دعا سلام لینے سے بھی گریز کرنے لگا۔ وہ خود کو اُن کے سامنے ایک مجرم کی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے لڑکی پر سختی بھی کر کے دیکھ لی تھی۔ اس کی رہائش سے پہلے چونکہ وہاں ایک سانپوں والے کا ڈیرہ تھا اس لئے بعض اوقات تو اب خود کر اُسے بھی اس گھر کی فضا سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ ایک دو بار تو اس نے بھی خواب میں سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس وہ چیخا نہیں تھا۔ بلکہ خواب کے ٹوٹ جانے پر بھی چند لمحوں تک وہ اسی کیفیت اور محویت میں رہا تھا۔

پچھلی جو رات گزر گئی ہے تب میں حسب عادت مطالعے کے بعد جب اُٹھا تو میں نے یوں ہی بالکونی کی جانب دیکھ لیا۔ میں بالکونی کی ریلنگ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ کالی چادر میں لپٹی ایک لڑکی رئیس احمد کے گھر سے نکلی اور بہت محتاط انداز سے ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی باہر دروازے کے قریب کھڑے ایک پتلے دبلے مگر خوبصورت سے اپنی ہی عمر کے ایک لڑکے کے ساتھ لگ کر چلنے لگی۔ لڑکا اجنبی تھا۔ اس کا تعلق اس گلی سے نہیں تھا۔ میں فوراً نیچے کی طرف بھاگا۔ اب وہ لڑکا اور لڑکی گلی کے درمیان میں پہنچ چکے تھے۔ میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا مجھے رئیس احمد اپنے دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق اور آنکھوں مین غصے کے شعلے تھے۔ اس نے گلی مین آ کر اُن دونوں کو للکارا انہیں رکنے کو کہا۔ لڑکی لڑکا پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے چلنے لگے۔ رئیس احمد گولی چلانے ہی والا تھا کہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

رئیس احمد چاہے وہ خیالی ہی سانپ تھا وہ نکل گیا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔ جو حقیقی واقع اس رات کے اندھیرے میں خاموشی سے ظہور پذیر ہو رہا ہے تم اسے ہوا دینے کیوں چلے ہو۔ لڑکی کو جانے دو۔ وہ ایک زندہ وجود ہے۔ تمارے گودام مین پڑی کوئی خالی بوری نہیں۔ وہ آزاد ہو رہی ہے۔ دیکھو اس کو۔ وہ کس شان سے اس دنیا کو ٹھوکر مار کر جا رہی ہے۔ اُسے جانے دو پلیز اور خود کو تماشہ نہ بناؤ۔ کہ یہ تمہارا نہیں وقت کا فیصلہ ہے۔

اس کے آگے اپنا سر خم کر دو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ رئیس احمد تم اندھے ہو۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں اندھا ہوں میں نے بھی کچھ نہیں دیکھا اور پردہ پوش رات یہ تو ہے ہی گونگی۔، بہری اور شاید ہم دونوں کی طرح اندھی بھی ہے۔ آؤ اپنے گھر کو چلیں۔ رئیس احمد نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بندوق نیچی کر کے اپنے گھر کو لوٹ گیا۔ گلی آرام اور سکون سے سوتی رہی۔

☆☆.....☆☆☆.....☆☆

Scanned with CamScanner

قاسو نمبردار

محمود عالی

پولیس والے جعلی مقابلوں یا تھانوں میں اور ڈرائیور حضرات سڑکوں پر حادثوں میں بے گناہ اور معصوم بندوں کو پھڑکا کر روتے ہیں نہ پچھتاتے ہیں خصوصاً ہائی وے یا شاہراہوں پر اچانک نمودار ہونے والے سائیکل سوار دیہاتیوں یا چرواہوں کو اپنی گاڑیوں کے ٹائروں تلے کچل کر، گاڑیوں کی ٹکر اور دوسرے حادثوں میں قتل عام کے بعد بھی بڑی مہارت سے فرار ہو کرنا معلوم ہو جاتے ہیں لیکن انہی سنگدل اور بے حس ڈرائیوروں میں سے ایک ڈرائیور سلیم عرف چھیما ٹنڈا گھپ اندھیرے میں خشک نہر کی ٹھنڈی ریت پر زخمی پڑا سچ مچ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا اور احساسِ جرم اور پچھتاوے کی شدت سے موسم کا سارا حبس اسکے سینے میں سما چکا تھا وہ چھبیس سال سے بس ڈرائیور کی حیثیت سے سڑکوں پر دندناتا پھر رہا تھا اور نو دس بار وہ اپنی بس دوسری بسوں سے ٹکرانے، ٹائی راڈ کھلنے پر بس الٹنے سے چند لمحے قبل ڈرائیونگ سیٹ سے باہر کود کر جائے حادثہ سے فرار ہونے کا تجربہ بھی رکھتا تھا پھر اگلے دن اخبار میں اسکی تفصیل ڈھونڈتا تھا لیکن بس ایکسیڈنٹ کی شدت، خوفناکی اور تباہ کاری کا آنکھوں دیکھا تجربہ اور جان لیوا احساس اسے پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ چلتی بس سے حسب سابق چھیمے نے چھلانگ تو لگا دی تھی مگر نہر میں پانی نہ ہونے کے باعث اسکا گھٹنا ٹوٹ گیا تھا ورنہ اسے اپنی غلطی سے برپا ہونے والی اس قیامت کا اندازہ کبھی نہ ہوتا اور وہ تو جائے وقوعہ سے فرار ہو کر فوری طور پر قبل از گرفتاری ضمانت کروا کے اپنے مالکوں کی دوسری بس کسی دوسرے روٹ پر چلا رہا ہوتا۔ حادثہ میں زندہ بچ جانے کی خوشی کا احساس بھی صحیح معنوں میں چھیمے کو آج ہی ہوا تھا مگر یہ احساس اب اس حادثے کی اندوہناکی میں پگھل رہا تھا۔ گھپ اندھیرا نہ ہوتا تو یقیناً زندہ بچ جانے والے مسافر اسے ڈھونڈ کر ہلاک کر ڈالتے۔ وہ اسی ڈر سے ہڈی ٹوٹنے کی تکلیف پر کراہ بھی نہیں رہا تھا۔ بس اس سے کافی دور آگے نہر میں ہی الٹی پڑی تھی زخمی اور پریشان مسافروں کی چیخ و پکار

Scanned with CamScanner

اور دل ہلا دینے والے بین جس بھرے گھپ اندھیرے میں یوم حشر بپا کر رہے تھے۔ حادثہ ہوا بھی ایسی جگہ تھا کہ کوئی گاؤں، ڈیرہ قریب نہ تھے ورنہ رات کے سناٹے میں لاری کے نہر میں الٹنے کا زوردار دھماکہ سن کر دور دراز کے دیہاتی بھی مدد کیلئے ضرور آجاتے دوسرے نہرے کے کنارے کی یہ سڑک بھی اتنی مصروف نہ تھی۔ ویسے بھی دیہاتوں کو جانے والی اکثر ایسی چھوٹی سڑکوں پر ٹریکٹر ٹرالیوں، تانگوں، ریڑھوں، گدھا گاڑیوں، چھکڑوں یا بسوں ٹرکوں کی آمدورفت اندھیرا چھانے سے پہلے ہی بند ہو جاتی ہے۔

چھیمے کو قاسو نمبردار یاد آنے لگا جو آج دوپہر کو ہی فرشتہ بن کر آیا تھا اور رحمت لٹا کر چلا گیا تھا اسے اپنے علاوہ بس کے کنڈیکٹر لیاقتے اور شدید میراثی پر بھی بے پناہ غصہ آرہا تھا جنہوں نے پہلے دیسی شراب کی پوری بوتل پلا دی اور بعد میں مرغ پلاؤ، پالک گوشت، زردہ اور سیخ تھا شہ لسی پلا دی تھی جس کے نتیجہ میں واپسی پر چھیمے کی بس کا سٹیرنگ ہوائی جہاز کے ہینڈلوں میں بدل گیا تھا اور بس اپنی اوقات اور برداشت سے کہیں زیادہ تیز چلنے لگی تھی۔ کئی دور اندیش بزرگوں اور کمزور دل خواتین نے چھیمے کو تیز رفتاری اور لاپرواہی سے منع بھی کیا تھا مگر مخمور چھیما ڈرائیور تو فوکر طیارے کے پائلٹ میں تبدیل ہو چکا تھا اور اب یہ پائلٹ اپنے تباہ شدہ فوکر طیارے کے بدقسمت مسافروں کا ماتم سن رہا تھا اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اس حادثہ میں آدھے سے زیادہ مسافر ہلاک ہو چکے ہونگے اور باقی ماندہ لوگ شدید زخمی ہوئے ہونگے وہ خود کو بڑا کمینہ، سفاک قاتل اور مجرم تصور کر رہا تھا کہ جس نے پل بھر میں خوشیوں بھرے سفر کو قبرستان بنا دیا تھا وہ باراتیوں کے کراہنے، چیخنے، رونے اور بین ڈالنے سے اندازہ کر رہا تھا کہ کونسی آواز کس سیٹ کے مسافر کی ہو سکتی ہے۔ ہر صدا اسکے ذہن میں ایک چہرہ اگا دیتی تھی وہ چہرے جو صبح سے اسکے ہم سفر تھے اور اب اندھیروں میں گھل رہے تھے۔ وہ آج صبح سویرے منڈی وار برٹن کے ایک گاؤں سے بارات بھر کر بچیانہ کیلئے بس میں روانہ ہوا تھا۔ باراتی بس کی گنجائش سے ڈیڑھ گنا زیادہ تھے شروع کی دس بارہ نشستوں پر آرام تھا جبکہ پچھلی تمام سیٹوں پر مذکر مونث باراتی اور باجے والے کافی وقت سے پھنسے بیٹھے تھے کچھ لوگ کمی کمین قسم کے تھے جو سیٹوں کے درمیانی راستے پر نیچے بیٹھے تھے اسی قسم کے کچھ لوگ اور نوجوان لڑکے مختصر سے سامان سمیت بس کی چھت پر سوار تھے اور ناچنے گاتے ہلڑ مچاتے جا رہے تھے۔ دولہا کا گھرانہ نچلے درجہ کے کاشتکاروں کا معلوم ہوتا تھا ورنہ بارات میں دولہا کیلئے الگ کرائے کی موٹر کار ضرور شامل ہوتی کیونکہ عزت اور شان و شوکت بگھارنے کا یہی تو ایک موقع ہوتا ہے مگر کار کہاں یہاں تو اچھے بھلے لوگ جانوروں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ چھیما ٹنڈا ایسے ہی خیالوں میں الجھا تانے بانے بنتا ہوا بس چلاتا جا رہا تھا اور فی الحال وہ خود کو ڈرائیور ہونے کے باوجود ان لوگوں سے برتر محسوس کر رہا تھا۔ اسکے بائیں ہاتھ والی سیٹ پر پسینے میں شرابور دولہا بھاری بھرکم سہرے سے لدا سرخ دوپٹہ اوڑھے اپنے جگری دوست سے راز و نیاز کر رہا تھا۔ بزرگ عورتوں، لڑکیوں اور دیگر رشتہ داروں نے اسے گھوڑیاں، ٹپے، ماہیے اور روایتی تہواری گیت گا گا کر اور لاگ لیکر دعائیں دیتے ہوئے بس میں چڑھایا تھا پھر بس چلنے پر سب اس سے چھیڑ چھاڑ اور مذاق کرنے لگے تھے وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستا رہا جبکہ اس کا دوست اسکے بدلے جواب دے رہا تھا بعض اوقات دولہا کی بوڑھی ماں کسی فقرے پر مذاق کرنے

Scanned with CamScanner

والوں کو غصیلا سا جواب دے دیتی حتیٰ کہ ایک دفعہ تو چھیمے کی نشست کے بالکل پیچھے بیٹھے پگڑ والے دولہا کے والد نے سب کو ڈانٹ کر چپ کروا دیا تھا پھر ہر سیٹ پر الگ الگ موضوع چلنے لگے تھے۔ چھیما سکون سے سگریٹ ہونٹوں میں دبائے بس چلا رہا تھا جہاں سڑک پر ٹریفک کم ہوتی وہاں وہ اسے سامنے اوپر لگے آئینے میں سے پیچھے بیٹھے باراتیوں کا نظارہ کرنے لگتا تھا۔ پگڑ والے دونوں بزرگ پگڑ گود میں رکھے ایک ٹوپی والے دبلے سے بابے کی معیت میں اونگھ رہے تھے کبھی کبھی اونگھ گہری ہونے پر انکے سر آپس میں ٹکراتے تو وہ گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے چھیمے کی ہنسی نکل جاتی تھی دولہا کا دوست یقیناً دولہا کے کان میں کوک شاستر پر مبنی معلومات پھونک رہا تھا کیونکہ وہ اکثر بات کرنے سے قبل اگلی پچھلی سیٹوں کا جائزہ لے لیتا پھر گردن کو کچھوے کی طرح اندر کی طرف گھسا کر دولہا کے کان میں ایسی بات اتار دیتا کہ دولہا جھرجھرا جاتا تھا اور اس انداز پر چھیما بھی اپنا وقت یاد کر کے ہلکے درجے کی جھرجھری محسوس کر لیتا تھا۔ چھیمے کی ان تمام باراتیوں میں سے شاہکار شخصیت اس باپ کی لگ رہی تھی جو دولہا کے پیچھے والی نشست پر بے بسی اور کم بچے خوشحال گھرانہ کی عملی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اوپر تلے کی عمروں کے چار عدد ضدی اور بدتمیز بچوں نے اسکا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ پہلے یہ چار سال سے کم عمر کے بچے باری باری دولہا کے سہرے اور دوپٹے کی پچھلی لڑیوں اور تاروں کو کھینچ کھینچ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک بار تو تنگ آ کر دولہا نے شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر انہیں انکے باپ سمیت ڈانٹ دیا تھا تب سے وہ باپ کے صبر کا امتحان لے رہے تھے۔ ایک بچہ جیب میں ہاتھ ڈالتا اور باپ کی جمع پونجی باپ کے روکتے روکتے نیچے گرا دیتا جسے باپ ٹوپی والے بابا کی مدد سے اٹھا کر دوبارہ جیب میں ڈال لیتا دوسرا بچہ گتے کی لال پنی والی عینک کو لہو کے بیل کی طرح باپ کی آنکھوں پر چڑھا دیتا۔ تیسرا بچہ باپ کے نتھنوں میں سگریٹ پھنسا رہا تھا چوتھا ڈبیا سے سگریٹ نکال تروڑ مروڑ کر نیچے پھینکتا جاتا تھا۔ باپ سگریٹ اٹھا کر اپنے بال، جیب اور ڈبیا درست کرنے لگتا تھا ان بچوں سے چومکھی لڑتے لڑتے باپ نے تنگ آ کر ایک سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ گود والے بچے نے جلتا سگریٹ پکڑ لیا اور بلبلا کر رونے لگا تب کہیں ساتھ بیٹھی عورت کی آنکھ کھلی اور بچہ اسے منتقل ہونے سے ظاہر ہوا کہ وہ اس ستم زدہ شخص کی بیگم ہے۔ چھیمے نے مسکرا کر آئینے میں سے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس فیملی کے پچھلی نشستوں پر دو والی سیٹوں پر تین تین خواتین اور تین سواریوں والی نشستوں پر چار چار باراتی بیٹھے تھے۔ خواتین اپنی اپنی ہانک رہی تھیں، نوجوان لڑکیاں دھیمی آواز میں آپس میں مگن تھیں کبھی کبھار وہ ڈھولکی اور تالیوں کی تھاپ پر لوک گیت گانے لگتی تھیں۔ سب سے پچھلی چند سیٹوں پر جلسہ عام ہو رہا تھا اور سیاسی تجزیے، تبصرے، دعوے اور اختلاف رائے چل رہے تھے کبھی کبھی بحث ہاتھا پائی تک پہنچ کر لوٹ جاتی تھی جس پر چھیما شیشے میں سے چونک کر دیکھنے لگتا تھا۔ ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد بس بڑی سڑک پر آئی ہی تھی کہ سامنے سے آنے والے دو تین ٹریکٹروں کے ڈرائیوروں نے اپنی اپنی ہیڈ لائٹس بار بار جلا بجھا کر مخصوص اشارہ دیا تو چھیما فوراً سمجھ گیا کہ آگے پولیس کا ناکہ لگا ہے اور چیکنگ ہو رہی ہے اس نے سپیڈ آہستہ کر لی۔ سامنے سے آنیوالی ٹریکٹر ٹرالی نے بھی ایسا ہی سگنل دیا تو چھیمے نے بس سڑک کے ایک طرف روک لی۔ ٹرالی بھی برابر میں آ کر رک گئی چھیمے نے پہچان لیا یہ اسکا گرائیں

Scanned with CamScanner

شادا توڑی والا تھا جو رکتے ہی بولا۔ ''اوئے! چھیمے ٹنڈے اگے نہ جانا مجسٹریٹ فل ناکے کے ساتھ چیکن کر رہا ہے''۔ چھیمے نے شادے کے انداز تخاطب پر سگریٹ منہ میں دبا کر غصے سے سلگائی اور تلخی سے بولا۔ ''اچھا میں سمجھا کہ تیری توڑی میں اگ لگی گئی۔ چیکن ہے تو کیا ہوا، ہمارے مالک تو باقاعدہ مہینہ پُچاتے ہیں ہمیں کیا خطرہ ہے۔ تو اپنی توڑی والی ٹرالی بچا۔ شادے توڑی''۔ شادا فوراً بولا۔ ''اوئے ٹنڈے اب خطرہ ہے اور لہور میں وزیراعظم کا جلسہ ہو رہا ہے۔ حوالدار شوکا بتا رہا تھا کہ سب افسروں، ڈی سیوں، تھانیداروں، ڈپٹیوں کے ملازم، سینٹری ورکر اور دوسرے غریب غرباء بندے بڈیاں بسوں اور ٹرکوں میں بھر بھر کر لہور کے جلسے میں پُچانے ہیں جلسہ بھرنا ہے۔ میں یہ بھی دیکھ آیا ہوں کہ مجسٹریٹ نے کئی سکولوں اور کالجوں کے ماسٹر اور بچے بھی مجور کسانوں کے ساتھ ادھر چوکی میں اکٹھے کر لئے ہیں۔ اوجھلیا! وہ مہینہ وہنہ نہیں دیکھتے بس خالی کروا کر بندے لد کے اگے پچا دیتے ہیں''۔ لیاقہ کنڈیکٹر بھی بس کے آگے آ کر کھڑا ہو چکا تھا بولا۔ ''اوئے جا اوئے اخیر توڑی والا ای رئیا ایں''۔ شادا جل کر بولا۔ ''تو اس بس میں گورنر لگا ایں روویں شکل نوں''۔ لیاقہ کھسیانہ ہو کر بولا۔ ''غور سے دیکھ یہ تو سپیشل برات والی بس ہے۔ اگے اون کنکٹ کی پھٹی لگی اے۔ کیوں استاد؟''۔ چھیمے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شادا ہنسنے لگا اور ارد گرد آہستہ آہستہ جمع ہونے والے باراتیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''بھولے بادشاہو! اگر بس خالی نہ کروائی تو جرمانہ لیں گے ہزار پندرہ سو۔ پبلک، افسروں اور پُلس کی روٹی واسطے۔ اون کنکٹ کی پھٹی تیرے منہ پہ ماریں گے۔ زیادہ شوق ہے تو اگے چلے جاؤ دو میل پہ خود ای پتہ لگ جائے گا۔ چنگا رب راکھا۔ ہر بندہ ای سیانا اے''۔ شادا، چھیمے، لیاقے اور باراتیوں کو سوچتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ بس رکنے پر کافی مرد باراتی بس سے نیچے اتر آئے تھے باقی ایک دوسرے سے کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کہتے ہوئے نیندوں، اُونگھوں اور باتوں سے بیدار ہو رہے تھے۔ ''اب کیا کریں استاد؟''۔ لیاقے نے ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب آ کر پوچھا تو چھیمے نے گردن گھما کر پچھلی سیٹ والے پگڑ پوش بزرگوں کو دیکھا جو اپنی کھڑکی میں سے شادے ٹرالی والے کی رپورٹ سن چکے تھے۔ ''بزرگو! اگے ناکہ ہے سمجھ لو کہ مدعا ہے ہزار پندرہ سو روپے کا۔ کیا ارادہ ہے؟''۔ چھیمے کے جواب میں تینوں بزرگ کچھ نہ سمجھتے ہوئے باری باری بولے۔ ''ارادہ کیا صلاح کرلو'' ۔ دولہا کا دوست بولا۔ ''چھیمے تو بس اگے لے چل دیکھا جائے گا۔ منہ وچ نئیں پالئے گا مجسٹریٹ''۔ جواب میں ایک بابا بولا۔ ''اوئے چپ رہ مامے خاں شوخانہ بن۔ او مجسٹریٹ کو جرمانہ تیرا پیو دے گا۔ لے چل کا بچہ''۔

''آہو۔ چٹی کون بھرے گا تیرا ابا''۔ دوسرا بابا کڑکا۔ جبکہ تیسرے بابے نے اسے حقارت بھری نظروں سے گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔ لیاقہ کھڑکی سے اندر دیکھتے ہوئے بولا۔ چوہدری جی۔ جلدی دسو، چلئے یا دو گھڑی اڈیک لئے؟ شامی جلسہ ہے اور دو گھنٹے بعد نا کہ اٹھ جائے گا، پگڑوں والی سیٹ کے پیچھے سے ایک سیانی عورت نے صلاح دی۔ ''چوہدری کچھ دیر رک جا اسی میں بھلیائی ہے۔'' پگڑ والے دولہا کے باپ نے بیوی کی ہاں میں فوری ہاں ملائی۔ ''آہو، ہالی تو صرف بارہ بجے ہیں، اگے کتے چھاں دیکھ کر گھڑی ڈنگ دیکھ لو پھر چلیں گے۔ دوسرے بابے نے فوراً تائید کی۔ ''آہو۔ رکنا چنگا اے۔ بہتر اے کہ بندہ دور اندیشی توں کم لے لوے۔'' ساتھ ہی بے چارے

باپ کی آواز اٹھی۔ ''ایہہ بزیر اعظم نے وی اج ہی جلسہ کرنا مرنا سی۔'' چھیمے نے گیئر لگایا بس رینگنے لگی اور باراتی ایک ایک کر کے بس میں چڑھنے لگے پچھلی سیٹوں پر ایک عورت کی کیا ہوا کیا ہوا؟ کر رہی تھی جسے اس کے مرد نے ڈانٹا۔ ''لہور جلسہ ہور یا تو جانا تقریر سُنن۔ شید تیری عقل ودھ جاوے''۔ خاتون شرمندہ ہوگئی۔ اخیری سیٹوں سے ایک منچلے نے دوسرے کو چھیڑا۔ ''اوئے فیقیا! لگا پتہ کہ نئیں۔ پرائم منسٹر کس طرح جلسہ کرتے ہیں۔ اخبار تے ٹی وی کہتا ہے کہ لوگ مارے جوش اور خوشی کے پرائم منسٹر کی تقریر سننے دوڑے چلے آئے پاگل ہوگئے۔ نعرے مارنے لگے قربان ہوگئے''۔ ''حکمراناں کو کیا پتہ کہ ان کے جلسے بھرنے کو کون قربان ہوتے ہیں؟'' لیاقے نے لقمہ دیا۔ ''ہر سیاسی سرکاری جلسہ اس طرح ہی ہوتا ہے۔ اسپغول تے کچھ نہ پُھول۔ ایک باجے والا بولا۔

''آہو۔ کھیتاں، دیہاتاں اور اڈیاں دے سارے ہاری کسان، دیہاڑی دار، سٹوڈنٹ تے چھوٹے بلدیاتی ملازم جلسے بھرن تے نعرے لوان واسطے بھیڑ بکریوں کی طرح لہور بھیجے جائیں گے پھر واپسی میں اونہاں نوں کس نے پچھنا ہے''۔ ایک اور دل جلا بولا۔ ''اج سمجھ آئی پئی جلسیاں وچ بندہ آتا کہاں سے ہے۔'' دُکھیا باپ نے لقمہ دیا۔ ''پبلک روٹی تے مہنگائی ہتھوں تنگ اے انکو جلسے جلوس کب سوجھتے ہیں۔'' سیانی مائی نے تنگ آ کر کہا۔ چھیما انہی آوازوں کی بازگشت میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چھاؤں کی تلاش میں بس کو دھیرے دھیرے آگے بڑھا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک سیاسی باراتی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ڈریور صاحب! اگر کاغذ پورے ہیں روٹ پکا ہے تو اگے چلو میں بحث کراں گا یہ ہمارا بنیادی حق ہے۔'' سب نے گردنیں گھما کر پیچھے دیکھا ساتھ ہی لیاقے کنڈیکٹر کی آواز گونجی۔ ''تسی کیا بحث کرنی ہے۔ استاد کے پاس گڈی کے کاغذ کیا اپنا ڈرائیوری لائسنس بھی نہیں ہے۔ سب ہنس پڑے اور چھیما کھسیانی سی مسکراہٹ میں بولا''۔ تو لائسنس کہیہ کرنا ہے میرا۔ ایک سواری بولی۔ ''شاید لائسنس وزیر اعظم کو دکھانا پڑے۔'' جواب میں ایک بابا بولا۔ ''اسکو لائسنس کیا دکھانا اسکے پاس تو ہر قسم کا لائسنس ہے''۔

''آہو۔ زمینوں پہ قبضے کرنے کا، قرضے لیکر معاف کرانے کا، بنک لوٹنے کا، ملک ڈبونے کا''۔ ایک اور ہنس کر بولا۔

''اوہناں کول تے ست خون معاف کرانے کا لائسنس ہوتا ہے۔ سیاسی مائی پھر بولی تُسی وی تو بڑے شوق سے ووٹ دینے بھکے پیاسے دھوپ میں جاتے ہو۔ قطاروں میں لگتے ہو لاٹھی چارج کرواتے ہو اور لیڈروں کے آگے پیچھے پھرتے ہو''۔ ایک اور رائے آئی۔ چھیمے نے ایک گاؤں کو جانے والی سڑک کے کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بڑی سڑک سے اتار کر بس روک دی یہ کسی گاؤں کو جانے والا موڑ تھا۔ یہاں لکڑی کے کھوکھوں پر مشتمل دوکانوں میں سائیکل کو پنکچر لگانے، ہوا بھرنے، حجام، سنیاسی، پھل، چائے سگریٹ کے علاوہ، گھروں کے دانے، چارے اور تانگوں کی مرمت کا انتظام بھی تھا۔ چھیمے نے انجن بند کیا تو سب دوکاندار حیرت سے بس کو تکنے لگے۔ مرد اور نوجوان باراتی سیاستدانوں اور نوکر شاہی کی پھیلائی کرپشن پر لعن طعن کرتے انگڑایاں اور جمائیاں لیتے ہوئے بس سے اترنے لگے۔ چھیمے اور لیاقے کی طرح اور کئی مسافر بس سے اتر کر چائے کے کھوکھے کی طرف بڑھے تو چائے والے نے مٹی کے تیل والے اسٹوو میں

Scanned with CamScanner

میں تیزی سے ہوا بھرنا شروع کر دی۔ خواتین، لڑکیاں بچے اور دولہا بس کی کھڑکیوں سے ماحول کا نظارہ کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں تین چار خوش پوش مسلح نوجوانوں سے لدی ایک جیپ وہاں آ کر رک گئی۔ نوجوانوں نے کھیتوں میں اتری بس اور باراتیوں کو دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کی پھر قریب ہی کتے کی طرح انگڑائیاں لیتے اک نوجوان سے پوچھا تو اس نے جیپ سواروں کو سارا ماجرا سنا دیا جس پر سب نوجوان جیپ سے نیچے اترے اور بزرگوں کی طرف بڑھے ان میں سب سے زیادہ خوش پوش اور نکھرے گھبرو نے نہایت خوش اخلاقی سے اپنا تعارف کروایا کہ اسکا نام قاسم ہے وہ قریبی گاؤں کا نمبردار ہے جبکہ اسکا باپ صوبائی وزیر ہے اور سارا علاقہ انکا انتخابی حلقہ ہے انکی زمینیں کئی دیہاتوں تک پھیلی ہوئی ہیں اس نے یہ تسلی بھی دی کہ بارات کو پولیس ناکے سے باعزت گزارا جائے گا پہلے بارات انکو مہمان نوازی کا شرف بخشے۔ سب ''نہ جی نہ جی مہربانی مہربانی'' کی گردان کرتے رہے مگر قاسم نے اپنے ڈرائیور کو پکارا۔ ''اوئے نورے ڈیرے چلا جا۔ لسی پانی کھان پین دا سامان، امپ شمب لے کے آ''۔ نورا ''اچھا جی'' کہہ کر جیپ لے گیا۔ چائے والے دوکاندار نے ایک چوبی تخت پوش کو اپنی قمیض کے لمبے دامن سے صاف کر کے قاسم اور اسکے ساتھیوں کو بٹھایا۔ قاسم نے بتایا کہ وہ دوستوں کے ساتھ مرغابیوں کے شکار پر جا رہا تھا۔ سب باراتی اسکی باتیں بڑے اشتیاق سے سن رہے تھے اور اسکی خوش اخلاقی سے متاثر ہو رہے تھے خواتین اور لڑکیاں کھڑکیوں سے جھانک کر اسکے متعلق سرگوشیاں کر رہی تھیں دس پندرہ منٹوں میں جیپ واپس آ گئی جس میں ساگ روٹیاں، مکھن اور لسی کے برتنوں اور آموں کے ٹوکے اٹھائے نورے کے ساتھ دو اور ملازم بھی تھے۔ ''واہ اتنی جلدی۔ ایناں کچھ''۔ ایک لڑکا حیرت سے بولا۔ قاسم نے اسے اترا کر دیکھا اور بولا۔ ''بادشاہو! ادھر اتنی ہی جلدی ہوتی ہے ہمارا گھرانہ جدی پشتی نمبردار، والد صاحب وزیر، دادا جی پٹواری تھے، ڈیرہ رات دن چلتا ہے اسلام آباد سے لاہور سے بڑے بڑے مہمان، امیر وزیر آتے جاتے رہتے ہیں''۔ نوکر سب کو پلیٹوں میں ڈال ڈال کر کھانا دینے لگے دولہا کا والد خوشی سے بولا۔ ''آہو جی، خاناں دے خان پروہنے۔'' قاسم کا ایک دوست بولا۔ ''ایسے ویسے پروہنے بابا جی۔ علاقہ کے سارے تھانے، چوکیاں اور سرکاری افسروں کا کھانا پینا رہنا سہنا بھی چوہدری صاحب ولوں ہوتا ہے۔ سب غلام ہیں ان کے یوں سمجھو''۔ نورے اور دوسرے کمیوں نے سارے مرد اور عورتوں، باراتیوں، باجے والوں بلکہ کھوکھے والوں کو بھی پلیٹوں میں ساگ مکھن، روٹیاں، لسی اور آم وافر مقدار میں تقسیم کر دیئے۔ سب کھا پی کر فارغ ہوئے تو قاسم نے نورے کو بلا کر اپنا وزیٹنگ کارڈ دیکر کہا۔ ''اوے نورے! سب کھا پی لیں تو یہ کارڈ لے کر پوری بس کو ناکہ پار کروا کر آ۔ انکو تلاشی بھی نہ لینے دینا۔ جلدی جا۔ شاباش'' کھا پی کر گھنٹہ بعد نورا جیپ میں اور چھیما بس کے سٹیرنگ پر بیٹھ گیا بس سٹارٹ ہوئی اور تمام باراتی باری باری قاسم نمبردار اور اسکے دوستوں بلکہ کھوکھے والوں سے بھی بڑے تپاک سے گلے ملکر مصافحہ کر کے خوش خوش بس میں سوار ہونے لگے۔ قاسم نے دولہا کو دو سو روپے سلامی ڈالی اور دولہا کے باپ کو دعوت دی کہ کوئی بھی مسئلہ ہو تو اسی اڈے پر آ کر یا کسی بھی قریبی گاؤں سے قاسو نمبردار کا ڈیرہ پوچھ لینا۔ لوگ تیر کی طرح سیدھے آپکو ڈیرے پر پہنچا دیں گے۔ دولہا کا باپ اپنی اوقات سے بڑھ کر پذیرائی پر چھلک پڑا اور آنسو پونچھتے ہوئے

دعائیں دیتا بس میں سوار ہو گیا۔ بس چلنے پر قاسم اور اسکے دوستوں نے بارات کو ہاتھ لہرا لہرا کر رخصت کیا اور پھر نعرہ لگا کر کہا'' قاسو نمبردار کا ڈیرہ یاد رکھنا''۔

اب پوری بس کا موضوع ہی قاسم نمبردار اور اسکا حسن سلوک تھا۔ ناکہ پر بے شمار بسیں، ٹرک اور ویگنیں رکی کھڑی تھیں۔ لاہور جلسہ کیلئے بہت سے بچے، جوان، بوڑھے، کسان، مزدور اور مقامی لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے جنہیں پولیس اہلکار سیاسی کارکن مختلف سواریوں میں پیک کر رہے تھے۔ ان سواریوں کے مالکان ڈرائیور اور مسافر سرکاری اہلکاروں کی منت سماجت کرتے پھرتے تھے مگر انتظامیہ اور پولیس والے ان ترلوں کا جواب گالیوں اور دھمکیوں سے دے رہے تھے مسافر بددعائیں دے رہے تھے جن میں اس بس کے باراتی بھی دل ہی دل میں شامل ہو گئے تھے۔ نورے کے چٹ دکھانے پر مجسٹریٹ اور دوسرے اہلکاروں نے بری آسانی اور عزت سے گزرنے دیا۔ بس نکلتے ہی نورے نے جیپ واپس موڑ لی۔

بارات قاسو نمبردار کے گن گاتے اور سیاستدانوں کی بدخوئیاں کرتی عصر کے وقت لڑکی والوں کے گاؤں میں داخل ہوئی۔ باجے والوں نے وردیاں جھاڑیاں اور قریبی ٹیوب ویل سے اپنے چہرے اور باجوں میں پانی پھرایا اور دل دہلا دینے والی تانیں شروع کر دیں۔ باقی باراتی بھی دولہا کے گرد جلوس کی صورت اختیار کرتے گئے۔ دولہا اور شہ بالا کے سہروں پر نوٹ وارے جا رہے تھے۔ چھیما اور لیاقہ بارات کے پیچھے پیچھے آہستہ رفتار سے بس لا رہے تھے۔

نکاح کے بعد سب کھانے پر ٹوٹ پڑے، لیاقہ اپنے پرانے واقف شدہ میراثی کے ہمراہ دیسی شراب کی بوتل لایا اور چھیمے سمیت تینوں نے کھیتوں میں چھپ کر خوب ڈٹ کر شراب پی۔ رخصتی ہوتے ہوتے مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ واپسی پر جہیز اور نچلے درجے کے باراتی چھت پر تے اور بسکے اندر لوگ پہلے سے زیادہ ہو گئے تھے کیونکہ چھت پر سے کافی لوگ بھی اندر آ گئے تھے اب نشستیں بھی بدلی ہوئی تھیں جو آگے تھے وہ درمیان میں اور جو درمیان میں تھے وہ پچھلی نشستوں پر ٹھنسے بیٹھے تھے۔ صرف چھیما ڈرائیور، دولہا دلہن اور دلہن کے ساتھ آرام والی خواتین آرام میں تھے ورنہ باقی بس اس طرح سے فل تھی کہ آپس میں باتیں کرنے کی جگہ یا گنجائش بھی نہ تھی پھر بھی دلہن والوں میں کیڑے ڈالنے اور نکالنے کی روایتی سرگوشیاں چل رہی تھیں۔ اس رش اور دھکم پیل سے بس کے اندر رسات کا حبس اور پسینہ کی چپچپاہٹ بڑھ گئی تھی اس لئے چھیمے نے اپنا گریبان کھول کر بس کی رفتار بڑھا دی تھی جس سے انکا نشہ اور بھی دو آتشہ ہو رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی مدھم اور ناکافی روشنی میں بس نہر کے کنارے کچی پھٹی سڑک پر اچھلتی کودتی گرتی پڑتی جا رہی تھی چھیما اسے اسکی برداشت اور اوقات سے کہیں زیادہ شدت سے اڑا رہا تھا کچھ بزرگوں اور عورتوں کے منع کرنے کی صدائیں اسے اور بھی غصہ دلا رہی تھیں۔ اسی دوران ایک گڑھا سامنے آیا اور نشے سے بوجھل پاؤں بریک کی بجائے ریس پر جا پڑا بس اچھلی اور بے قابو ہو گئی۔ چھیما نشے میں ہونے کے باوجود ڈرائیورانہ مہارت سے باہر کود گیا اور بس گھپ اندھیرے میں چیخوں، دھماکوں اور گرد و غبار میں تحلیل ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ زخمی مرد و زن، بچوں اور بوڑھوں کی

Scanned with CamScanner

آہ و بکا اور گریہ زاری شروع ہوئی جو مرنے اور زخمیوں کے ناموں کے بینوں اور چیخ و پکار میں بدلتی گئی۔ گھٹ گھٹ کر رونے سے ہچکی اپنی ہچکی بندھ گئی تھی۔ باراتی رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اس ماتم میں گھڑ سواروں کی آواز گھوڑوں کی ٹاپیں بھی شامل ہوتی گئیں۔ یقیناً قریبی دیہاتوں کے ہمدرد دیہاتی مدد کو آپہنچے ہیں۔ یہ سوچ کر چھیما ٹوٹی ٹانگ سنبھالے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھپ اندھیرے میں آسمان سے روشن ستارے اور روشن ہو رہے تھے پھر ٹوٹ پھوٹ کی آوازیں آنے لگیں۔

''ہائے میرا زیور''۔ ایک عورت چیخی۔ ''وہٹی لبھ کدر ہے''۔ ایک بھاری آواز آئی۔ ''وے ویرا! مینوں چھڈ دے دے توں کون ایر وے رحم کر ظالما''۔ یہ شاید دلہن تھی۔ پھر طرح طرح کی آوازیں فضا میں چیخنے لگیں۔ ''اوئے میں مر گیا''۔ ''مینوں ہتھ نہ لاؤ''۔ ''ہائے ماں میری عزت بچالے۔ رہا۔ قاسو نمبردارنوں بھیج دے''۔

''ٹرنک توڑو''۔ ''جلدی کرو''۔ ''اوئے ایہہ زیور مینوں پھڑا''۔ ''چھیتی مر پلس نہ آجائے''۔

چھیما سمجھ گیا کہ ڈاکو باقی ماندہ بس کو برباد کرنے آپہنچے ہیں۔ وہ اندھیرے میں ٹارچوں سے تلاشیاں لے رہے تھے۔ چھیما ٹانگ پکڑ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک گھڑ سوار نے آکر اسکی پشت پر لات اور چہرے پر ٹارچ ماری۔ ''استاد یہ ڈرائیور لگتا ہے''۔

''اسکی جیب دیکھ۔ فل تلاشی لئیو''۔ استاد کے حکم پر ڈاکو نے گھوڑے سے اتر کر چھیمے کو قصائی کی طرح الٹا سیدھا کیا اور خالی جیب کی پاداش پر ٹارچ سر پر دے ماری۔ ''استاد یہ تو کورا ہے''۔ آدھا گھنٹہ سے اوپر لوٹ مار کرنے کے بعد استاد کی آواز ابھری۔ ''چلو۔ واپس۔ جلدی کرو۔ ہری اپ۔'' لوگوں کے گلے بیٹھے گئے تھے آہ و زاری تا حال ہو رہی تھی ڈاکو مال سمیٹ کر گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ ''چلو۔ آؤ''۔ استاد نے چھیمے کے قریب سے ہی کہا اور سگریٹ سلگایا۔ چھیمے نے بمشکل لمحہ بھر اس کا روشن چہرہ دیکھا اور حیرت، دہشت اور خوف سے اسکا دم گھٹنے لگا۔ یہ قاسو نمبردار تھا۔ چھیما گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی ریت کے بادلوں میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆.....☆☆☆.....☆☆

Scanned with CamScanner

نمرود کے شہر میں تفریق کی گٹھڑی

لطیف ساحل

یہ شہر کس قدر خوبصورت ہے، شاید آپ اس کا اندازہ کبھی نہ لگا سکیں۔ یہاں کے درخت، پھول، زمین، مکان اور راستے، ہر چیز شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ جب کبھی میں بہت اُداس ہو جاتا ہوں تو سارے شہر کی سیر کرتا ہوں، لیکن شہر سے باہر واقع پتھروں کی بستی کی طرف کبھی نہیں جاتا کیونکہ اس کے بارے میں طرح طرح کے واقعات مشہور ہیں۔

یہ شہر نمرود کی خدائی میں آباد کیا گیا تھا۔ تب سے ہم ہمارے آباؤ اجداد اسی شہر میں مقیم ہیں۔ نمرود نے یہ شہر صرف شیشوں سے تعمیر کروایا تھا اور تمام پتھر شہر سے باہر ویرانوں میں پھنکوا دیے تھے۔ وہ ہمیشہ اندھے سیاہ شیشے ہی استعمال کیا کرتا تھا۔ آئینوں سے اسے سخت نفرت تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ آئینے تفریق کے معمے کو جنم دیتے ہیں۔ اس زمانے میں قومیں داہموں پر ایمان رکھتی تھیں۔ جس شخص کا واہمہ جس قدر راسخ ہوتا، اس کا ایمان اتنا ہی پختہ سمجھا جاتا اور اسے اتنا ہی بڑا عامل اور بزرگ گردانا جاتا۔ آئینوں کے بارے میں نمرود کا خیال تھا کہ یہ انسان کو بوڑھا کر دیتے ہیں اور جب بھی کوئی شخص آئینہ دیکھتا ہے، اس کی قوت اور زندگی کی مدت کا ایک حصہ عکس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ موت کے فرشتے کا تصور تو بہت بعد کی بات ہے، اس زمانے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ بار بار آئینہ دیکھنے سے انسان کا عکس طاقتور ہو جاتا ہے اور آخر کار وہی انسان کا گلا دبا دیتا ہے۔ یوں کہیے کہ اُس کا اپنا عکس ہی اُس کے لیے موت کا فرشتہ ثابت ہوتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ نمرود کی موت بھی اسی طرح واقع ہوئی تھی۔ ایک دن اس کا عکس آئینے سے باہر آ گیا اور اس نے اس کا گلا دبا دیا۔

موت سے پہلے نمرود نے اپنے عکس پر بڑے ظلم ڈھائے تھے اور اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ کسی نے اس کی خدائی کو چیلنج کر دیا تھا اور دلیل یہ دی تھی کہ اگر تم خدا ہو تو تمہارا عکس کیوں کر ہو سکتا ہے؟ خدا تو لاشریک ہے اور اس کا کوئی عکس نہیں..... چیلنج کرنے والے کا جو انجام ہوا اسے تو سب جانتے ہیں، لیکن نمرود نے اپنے عکس پر بھی بڑی زیادتیاں کیں۔ اس نے محل میں موجود تمام آئینوں کو توڑ ڈالا اور وہاں بے رنگ اندھے شیشے لگا دیے۔ اس نے دریا اور تالاب بستیوں کی قریب سے اٹھوا دیے اور کھلے عام پانی لے کر چلنے اور اسے ڈھانپے بغیر پینے پر پابندی لگا دی تاکہ پانی میں کسی کو اپنا عکس دکھائی نہ دے سکے۔ پانی صرف حاکم ہی پی سکتے تھے، غریبوں کو صرف

Scanned with CamScanner

کیچڑ جانے کی اجازت تھی۔ لوگوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم تھا۔ جو شخص بھی نمرود کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا اسے اندھا کر دیا جاتا تھا۔ خیال تھا کہ اس کا عکس دوسرے شخص کی آنکھ میں چلا گیا ہے۔ اس نے تمام لوگوں پر آئینہ دیکھنے کی پابندی لگا دی البتہ اس کے ایک آئینہ ایسا ضرور تھا جس میں وہ دنیا کا حال دیکھا کرتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا اپنا عکس اسی آئینے میں جا چھپا ہے۔ جب اس نے دنیا کا حال جاننے کے لیے آئینے میں جھانکا تو اس کا اپنا عکس اس میں ظاہر ہو گیا۔ تب کیا تھا عکس نے طلسماتی آئینے سے باہر نکل کر اس کا گلا دبا دیا۔ اسی روز سے اس شہر کے ہر شخص نے ایک ایک آئینہ اپنی پشت سے باندھ کر اپنے عکس کو اس میں قید کر رکھا ہے۔

میں نے بھی اپنے عکس والے آئینے کو بڑی احتیاط سے اپنی کمر کے ساتھ باندھا ہوا ہے۔ اگر آئینہ ٹوٹ جائے تب عکس کا آزاد ہونا اور میری موت کا واقع ہونا لازمی بات ہے۔ زندگی، مجھے اور میرے قبیلے کے دوسرے لوگوں کو اس لیے بھی عزیز ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود ہم جوان ہیں کیونکہ ہم نے اپنے آپ کو کمزور اور اپنے عکس کو طاقتور ہونے نہیں دیا کبھی آئینہ نہیں دیکھا اور شہر سے باہر پتھروں کی بستی کی طرف کبھی نہیں گئے۔ جب یہ شہر آباد کیا گیا تھا۔ تو شہر کے سارے دریا، پتھروں کی بستی میں منتقل کر دیے گئے تھے میں جب کبھی اُداس ہوتا ہوں تو سارے شہر کی سیر کرتا ہوں، لیکن شہر سے باہر پتھروں کی بستی کی طرف جانے والے راستوں کا رُخ کبھی نہیں کرتا۔ پتھروں کی بستی کے بارے میں طرح طرح کے واقعات مشہور ہیں۔ اُس میں بہنے والے دریا کو طلسماتی دریا کہا جاتا ہے۔ جس میں قید تمام عکس دیوانوں کی طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے ہیں اور رہائی کے لیے شور مچاتے رہتے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ آج بے خیالی میں اچانک میں شہر سے باہر آ گیا ہوں اور اس بے بسی کے عالم میں اس شہر کی تاریخ کے طلسماتی واقعات ایک اک کر کے میرے آنکھوں کے کے سامنے آ رہے ہیں میں واپس لوٹ جانا چاہتا ہوں، لیکن زمین مجھے آگے ہی آگے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ میری پشت پر بندھا ہوا میرا عکس بھی مجھے آگے دھکیل رہا ہے اور میں قدم اٹھائے بغیر آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ پتھر ہیں کہ جا بجا بکھرے ہوئے ہیں..... پتھر جن کی کوئی انسانی شکل نہیں، پھر بھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں انسانوں سے مل رہا ہوں۔ انہیں چھونے اور اٹھا کر گود میں رکھنے کا بھی ایک مزہ ہے۔ سرخ، سیاہ، سفید، نیلے، سبز، سلیٹی، پہلے..... ہزاروں رنگوں کے پتھر!! کیا پتھروں میں بھی رنگ و نسل ہوا کرتے ہیں؟ کیا ان میں بھی طبقات ہیں؟ کیا ان کی ہیئت، ان کی صورت، ان کی قدر و قیمت اور ان کا کردار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے؟ سخت، بے حس، بے جان پتھر..... پتھر کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اس کے باوجود میری نگاہ سیاہ پتھر کی نسبت سفید پتھر کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ البتہ ایک سیاہ پتھر ایسا فرد ہے جس پر تمام سایے جھپٹ رہے ہیں اور اُسے بار بار چومنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا یہ میری نگاہ کا دھوکہ ہے، میری پسند اور تمنا کا کرشمہ ہے۔ یا کچھ اور یا دو مختلف جسموں کا ثبوت ہے یا تفریق کا کوئی معمہ؟ میں سفید پتھر کی چکناہٹ پر بار بار پیار سے ہاتھ پھیر رہا ہوں اور اس ملائم سفید پتھر کو دیکھ کر میرے دل میں، کتنی عجیب خواہش جنم لے رہی ہے کہ اس سفید پتھر سے میں ایک گھر بناؤں، تاج محل کی طرح، جہاں میری محبت پروان چڑھے اور جہاں میں سکھ، امید اور

فراغت کے دن گزار سکوں ..... میں غزلیں لکھوں اور کوئی مغنیہ اپنے دلکش ترنم سے انہیں سجاتی رہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر یہ سفید پتھر نہیں ہونگے تو نہ تاج محل بن سکے گا، نہ میری محبت پروان چڑھ سکے گی، نہ میں غزلیں لکھ سکوں گا، نہ انہیں کوئی گا سکے گا۔ پھر میں سوچتا ہوں اگر زندگی میں نہیں تو مرنے کے بعد ہی اس سفید پتھر سے میری قبر بنادی جائے ..... کم از کم میری قبر ہی میرے تصورات کی خوبصورتی کو ظاہر کر سکے اور لوگ اسے تجسس آمیز نظروں سے دیکھ سکیں۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ کہیں یہ سب پتھر، پتھرائے ہوئے انسان ہی نہ ہوں اگر واقعی ایسا ہی ہے تو کیا ہم انسانوں کے وجود کو کاٹ کر اپنا گھر بناتے ہیں ..... میری روح کانپ اٹھتی ہے۔

نمرود کا شیشوں کا شہر یہاں سے، جہاں میں پتھروں کی بستی میں کھڑا ہوں، بہت دور دکھائی دے رہا ہے میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک لمبا راستہ میرے اور اس کے درمیان حائل ہے اور اب تو میں اپنے قدموں سے، اپنی مرضی سے سفر کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔ ننگے پاؤں مٹی پر چلنے سے ایک نئی لذت کا احساس ہو رہا ہے۔ اندھے اور تاریک شیشوں کے در و دیوار میں رہتے رہتے تو ایک عجیب گھٹن سی ہونے لگی تھی۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ میں کتنے بے جان ماحول میں رہتا تھا اور ان پتھروں میں زندگی کا احساس کس قدر نمایاں ہے۔

شاید میرا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرا گیا ہے۔ خون کے قطرے اُبل کر میرے پاؤں کے انگوٹھے پر آ گئے ہیں اور سرخ آبدار موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر آج پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا ہے کہ میں بھی زندہ ہوں، میری رگوں میں بھی خون دوڑتا ہے اور میرے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ نمرود کے شہر میں تو صدیوں تک مجھے کسی تبدیلی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ تکلیف کا احساس میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ مجھے اپنے زخمی پاؤں پر پیار آنے لگا ہے اور اس درد میں مجھے عجیب طرح کی لذت محسوس ہونے لگی ہے۔ نوکیلا سرخ پتھر، میرا پاؤں زخمی کر کے کچھ دور پڑا میرا منہ چڑا رہا ہے۔ شاید وہ ہر شخص کو اسی طریقے سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جی تو چاہتا ہے ایک زوردار ٹھوکر مار کر اسے کہیں دور پھینک دوں، لیکن پاؤں تو پھر بھی میرا ہی زخمی ہوگا ..... دوسرے پتھر کتنے مہربان اور خوش شکل ہیں۔ اس سرخ نوکیلے پتھر کا نام کچھ اور کیوں نہیں رکھ دیا جائے ..... کم بخت پتھر کے نام کو بدنام کر رہا ہے۔

لیکن یہ کیا؟ یہ روشن پتھر کہاں سے آ گئے؟ کیا پتھروں میں بھی چراغ اور ستارے ہوتے ہیں؟ کیا یہ زمین کا کوئی منفرد ٹکڑا ہے یا کسی روشن ستارے کا روشن حصہ! اب جبکہ تاریکی ہر طرف بڑھتی جا رہی ہے یہ روشن پتھر ہی میری رہنمائی کر سکے گا۔ اس کی مدد سے میں اپنا راستہ بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔ یہ پتھر بھی تفریق کے معمے کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ آج کی رات اس معمے کے تمام حصوں کو اکٹھا کر کے کہانی مکمل کرنی ہے۔

روشن پتھر کی روشنی نے تاریکی کے خوف کو مٹا دیا ہے۔ ویسے بھی میں اکیلا نہیں رہا کیونکہ اس کی روشنی نے مجھ میں سے میرا سایہ آزاد کر دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی مجھے اپنے سائے سے بھی خوف آنے لگتا ہے۔ معلوم نہیں یہ میرا دوست ہے یا دشمن! کیا خبر کسی تنگ اور پیچیدہ

Scanned with CamScanner

گھاٹی کے موڑ پر یہ مجھ پر ہلہ بول دے۔ پھر مجھے اس کے لیے لمبے لمبے ہاتھوں سے کون بچائے گا۔ خیر، جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا.....۔

شاید کوئی میرے ساتھ چل رہا ہے..... چلتا رہے!

شاید کسی نے میرا نام پکارا ہے..... چلتے رہو لطیف ساحل! پتھر کسی کو آواز نہیں دیتے۔

شاید کوئی سسک رہا ہے..... ہوا کے علاوہ اور کون ہوگا!

کسی کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی رہی ہے..... رات اپنا لباس تبدیل کر رہی ہے اور کوئی نہیں!

کہیں یہ ساری حرکتیں خاموشی کی نہ ہوں کبھی کبھی خاموشی بھی بولنے لگتی ہے۔ اپنے آپ کی نفی کرنا کبھی کبھی اسے بھی اچھا لگتا ہے۔ اسے بھی اپنے ساتھ لے لو۔ یہ بھی تفریق کے معمے کا ایک حصہ ہے۔

ترنم..... میرے چاروں طرف ترنم! وہی دریا، نمرود نے شہر سے باہر نکال دیا تھا، چاندنی رات میں میرے سامنے بہتے ہوئے کتنے لگ رہا ہے چاند کا عکس پانی کی جھلملاتی ہوئی لہروں میں تیر رہا ہے۔ نمرود نے تو کہا تھا کہ عکس چیزوں کو بوڑھا، کمزور اور بھدا کر دیتا ہے، لیکن چاند کے عکس نے تو چاند کو مزید خوبصورت بنا دیا ہے۔ آج میرے دل میں نمرود سے بغاوت کرنے کی خواہش بیدار ہو رہی ہے۔ مجھے اس کی کہی ہوئی ہر بات جھوٹ معلوم ہونے لگی ہے۔ اُس کا پھونکا ہوا طلسم یقیناً شکست کے آخری مرحلے پر ہے۔ پانی پتھروں سے ٹکرا کر گزر رہا ہے۔ پانی کے اندر ایک گنگناہٹ سی جا رہی ہے، لیکن یہ آواز کس کی ہے! پتھروں کی یا پانی کی؟ پانی بھی خاموش، پتھر بھی بے زبان!! شاید آواز، پانی اور پتھروں سے بالکل علیحدہ، کوئی مکمل اور زندہ شے ہے۔ شاید یہ وہ زندہ شے ہے جس کا کوئی جسم نہیں۔ اسے ہمیشہ کسی پیکر کی تلاش رہتی ہے۔ جب اسے جاندار، بے جان، یا کائناتی عوامل کی شکل میں کوئی بھی شے مل جاتی ہے تو وہ بھول اٹھتی ہے۔ پانی اور پتھروں کے ملاپ نے آج آواز کو زندہ کر دیا ہے۔

روشن پتھر، میرا عکس، میرا سایہ، خاموش اور آواز..... میں نے سب کو ایک ساتھ اچھی طرح کس کر گٹھڑی میں باندھ لیا ہے۔ پانچوں کے پانچوں مجھ سے خفا ہیں میں نے ان سے ان کی آزادی چھین رکھی ہے، لیکن میں انہیں آزادی دے بھی کیسے سکتا ہوں؟ میں بھی تو صدیوں سے قید تھا۔ مجھے آزاد کرانے میں بھی تو کسی نے میری کوئی مدد نہیں کی! آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے نمرود کی حکم عدولی کی ہے اور اس کے شہر سے باہر نکل کر یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ آج میں آزاد ہوں اور باقی چیزیں میری گرفت میں، میری گٹھڑی میں قید!

ساری رات کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں گزر گئی ہے افق پر ہلکی سی روشنی پھیل رہی ہے، لیکن آج کا روشن افق، کل کے تاریک افق سے کتنا مختلف ہے۔ گزشتہ رات کی تفریق در تفریق نے میرے ذہن کو چکرا دیا ہے۔ میرا سوچتا ہوں کائنات کے ہر راز میں ایک

Scanned with CamScanner

دوسرا راز پوشیدہ ہے اور ہر وجود میں ایک دوسرا وجود..... جیسے پتھر میں روشنی، روشنی میں سایہ..... آئینے میں عکس، عکس میں موجود ..... خاموشی میں آواز اور آواز میں زندگی۔ تمام چیزیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی ہیں جیسے زنجیر کی ان گنت کڑیاں۔ یہ کیسی تفریقیں ہیں جو ایک دوسرے کا اثبات کر رہی ہیں۔ آج مجھے پہلی بار علم ہوا ہے کہ تفریق کے عمل سے بھی جمع کا سوال حل کیا جا سکتا ہے۔ آج مجھے پہلی بار پتا چلا ہے کہ تمام تفریقیں مل کر ایک جمع بن جاتی ہیں۔

دریا کے اس پار سے آتی ہوئی مؤذن کی آواز نے مجھے چونکا دیا ہے۔ اذان، جمع کا استعارہ اذان، مجھے کتنا بھلا لگ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نمرود کی خدائی کے خاتمے کا اعلان ہو رہا ہو، جیسے صدیوں بعد کسی طلسم کدے سے مجھے رہا کیا جا رہا ہو میں بھی آج تفریق کی گٹھڑی میں بندھی ہوئی تمام چیزوں کو رہا کر دوں گا..... لیکن یہ کیا؟ تفریق کی گٹھڑی میں ایک بے نور پتھر اور ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میرا سایہ اور میرا عکس مجھ میں واپس لوٹ گئے ہیں، آواز خاموشی میں ڈوب گئی ہے، روشنی پتھر میں جذب ہو گئی ہے، نمرود کا شہر غائب ہو گیا ہے، صدیوں کے داہموں کا طلسم ٹوٹ گیا ہے، ایک نئی آباد بستی میں دریا دروازوں کے آگے بہنے لگے ہیں۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

رضیہ سلطانہ

نصیر اعظم

ابھی ٹی وی ڈرامے میں تھوڑی دیر تھی، دونوں بچیاں، رجو اور بھوندو رحمت بی بی کے کمرے میں براجمان تھے، یہی وہ وقت ہوتا کہ سب اپنے اپنے مسائل اور اختلافات بھول کر ایک خوبصورت دنیا میں پہنچ جاتے، نہ رجو کو ساس کے طعنے یاد رہتے، نہ رحمت بی بی کو بہو کی تیزی کا خیال رہتا نہ ہی بھوندو فیکٹری کی سیاست پر بات کرتا اور نہ ہی بچیوں کو اپنی ضدیں یاد رہتیں۔ شہر کی ایک بہت بڑی کچی آبادی ترک کالونی میں دو کمروں، ایک کوٹھری اور محدود سے آنگن والے گھر میں یہ چھوٹا سا خاندان رہتا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ایک طرف بان کی چارپائی تھی، سامنے ایک تپائی پر ٹیلی ویژن تھا، اور ایک طرف کونے میں ایک چھوٹا فرج تھا جسے رحمت بی بی الماری کی طرح استعمال کرتی تھی اور آنے جانے والیوں کو فخر سے بتاتی تھی اسکا چھوٹا بیٹا اصغر یہ سب دبئی سے لایا تھا۔ دادی۔۔۔۔ ڈرامہ کب شروع ہوگا؟ بڑی بیٹی بینا نے پوچھا۔ 'صبر کرو ابھی ہوگا۔۔ جرا استہار تو کھتم ہوں' رجو نے دلاسہ دیا۔ اچانک زور سے بجلی کڑکی اور دونوں بچیاں سہم کر ماں سے لپٹ گئیں۔ 'ارے میری بیٹیاں اور ڈرپوک' رجو زور سے ہنس پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے زور کی بارش شروع ہوگئی۔ رجو دوڑ کر مختصر سے آنگن سے بالٹی اٹھالائی، اسے معلوم تھا کہ اب رحمت بی بی کا کمرہ ٹپکنے لگے گا۔ 'چلو اب کل تو کام پر جانا نہیں ہوگا' بھوندو ماں کے پلنگ پر پسرتے ہوئے بولا۔ 'ہاں اس بارش میں کہاں جائیگا' ماں نے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا' لے اب جرا سی بارس سے تو کام دھام بھی چھوڑ دیگا؟ ارے اصگر جو لمبے پلاسٹک کے جوتے لایا تھا وہ پہن کر آرام سے چلے جانا اور باہر میں اینٹیں رکھ کرا سپر تکھتہ بھی رکھ دوں گی۔ 'رجو نے تسلی دی۔ 'تیرے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے' وہ مسکرایا۔ کیوں نہ ہو ڈپھنس کی لڑکی ہوں اور نام ہے رجیہ سلطانہ، رجو نخریہ لہجے میں بولی۔ 'ہاں لگے ہے بنگلے سے آئی ہے، سرونٹ میں تو

Scanned with CamScanner

تھی رجیہ سلطانہ ' ساس بھی کہاں چوکنے والی تھی، اور ایکدم بجلی غائب ہوگئی۔ چلو گارت ہو اڈرامہ۔۔۔ بھوندو کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور اپنے کمرے کی طرف چلدیا، اسکا نام تو انور تھا لیکن سمجھ کمزور ہونے کی وجہ سے بچپن میں محلے کے بچے بھوندو بھوندو کہ کر اسے چھیڑتے تھے اور چھیڑ ہی چھیڑ میں وہ انور سے جانے کب بھوندو بن کر رہ گیا، اسکی بڑی خواہش تھی کہ سب اسے اسکے اپنے نام سے پکاریں مگر کبھی کسی کو روکنے کی ہمت نہ کر پایا بس خواہش کر کے رہ جاتا۔ رجو اسکی یہ کمزوری جانتی تھی اور اسکو جب زیادہ پیار آتا یا کوئی کام کروانا ہوتا تو تو بڑے میٹھے لہجے میں اسطرح انور پکارتی کہ وہ پگھل کر رہ جاتا اور عجیب سا سرور بدن میں دوڑ جاتا اور وہ رجو کا بچہ جمہورا بن جاتا۔

رحمت بی بی کو خود پر بڑا ناز تھا کہ اس نے تین مردوں کو جنم دیا، اکبر، انور اور اصغر، اصغر جو سب سے چھوٹا تھا اسکی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اسے اگر کوئی دکھ تھا تو یہ کہ اسکا بھوندو اولاد نرینہ سے محروم تھا، اور جب موقع ملتا وہ بہو کو لڑکا نہ ہونے کا طعنہ ضرور دیتی اور خاص طور سے جب کسی بات پر اس سے ناراض ہو۔ آج بھی یہی ہوا گو بارش بند ہو چکی تھی اور موسم کھل چکا تھا مگر ماں مصر تھی کہ بیٹا کام پر نہ جائے لیکن رجو زبردستی بھیج رہی تھی۔ 'اتنا تو کیچڑ ہوگا باہر نہ جا بیٹا۔۔۔' ماں نے ایک کوشش اور کی 'انور۔۔ کیچڑ ہونے سے کام تو نہیں بند ہوتے۔۔۔ اور بھوندو اپنے نام اور بیوی کے مٹھاس بھرے لہجے میں سب کچھ بھول کر دھیمی مسکان لئے گھر سے نکل گیا۔ ' اری نامرادا گر اسے کچھ ہو گیا؟ ساس تڑخی۔

' کچھ نہیں ہوتا اسے، اچھا سور نہ کر سویرے صبح میں دکان کھولنے جا رہی ہوں۔ رجو کوٹھری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ 'ہاں سب جانتی ہوں آج اتنی جلدی تجھے کیوں ہے دکان کھولنے کی جیادہ مرد ہی آئینگے ' ساس نے ایک رکیک حملہ کیا، حالانکہ وہ جانتی تھی یہ اسکی بہو ہی تھی جس نے گھر میں ایک کوٹھری بنا کر گلی میں کھڑکی کھلوالی تھی اور اسے ' کالونی دکان ' کا نام دیدیا تھا جس سے گھر کی معیشت پر اچھا اثر پڑا تھا۔ محلے کے لوگ جن میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی ہوتی، اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لئے اسکی دکان کا رخ کرتے تھے اور رحمت بی بی یہ بھی جانتی تھی کہ اگر کبھی کوئی مرد سودا لینے آجاتا تو اس سے کہتی ' بھائی جلدی بتاؤ کیا لینا ہے، آج بھوندو دیر سے کام پر جا رہا ہے یا کسی اور جھوٹے بہانے سے جتا دیتی کہ اسکا شوہر گھر پر ہی ہے۔

'اری رجو دن چڑھ چکا ہے کب سے کہہ رہی ہوں پانی گرم کر دے نہانے کو، رحمت بی بی کمرے سے نکل کر اُسے آواز دیتی کوٹھری کی جانب چل پڑی۔

'جرا ان لوگوں سے تو نبٹ لوں، ابھی آتی ہوں ' اس نے ساس ہی کے لہجے میں جواب دیا۔۔۔ 'ہاں یہ لے موم بتی اور ماچس۔۔۔ کیا آج بھی بتی نہیں آئیگی؟ اسنے پٹھانی بوا کی بہو کو سودا دیتے ہوئے پوچھا۔ 'ہاں وہ شیرو کا بابا بتاتا ہے۔۔۔ پٹھانی کی بہو پھولے سانسوں سے بولی۔ 'یہ کیا چار بچے بہت نہیں تھے۔۔ پانچ سال میں پانچواں بچہ۔۔۔ رجو کو اسکی حالت پر بڑا ترس آرہا تھا۔

Scanned with CamScanner

'بس کیا کرے ہم عورت لوگ۔۔۔۔وہ خاموش ہوگئی۔میرے پاس آنا تجھے بتاؤں گی بچہ روکنے کی ترکیب۔۔۔رجو رازداری سے بولی۔
'تم کوئی دوا کھاتی ہے؟ پٹھانی کی بہو نے پوچھا۔نہیں اور بھی ترکیب ہے۔۔۔وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی
رجو۔۔رجو ساس پھر چلائی۔۔پتہ نہیں میرے بھوندو کو تجھ میں کیا نجر آ گیا تھا۔۔۔کتنی لڑکیاں تھیں۔۔وہ اب کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گئی تھی' کھیر۔۔کھیر کھالہ یہ تو نہ کہہ مجھے سب کھمر ہے یہ سادی بھوندو سے جیادہ تیری مرجی سے ہوئی تھی۔۔۔میری اماں تو نہیں چاہتی تھی، وہ تو کسمیر میں اپنے بھتیجے سے چاہ رہی تھی،وہ آخری گا بگ نپٹاتے ہوئے بولی اور دکان کی کھڑکی بند کردی۔"میری مرجی سے؟ کھدا نہ کرے جو میں تیری جیسی کو لاتی اور پھر ہم ترکستان کے لوگ اور تیرا کھاندان۔۔۔"رجو زور سے ہنس پڑی اور ساس کے سامنے جھک کر رازداری سے بولی' کھالہ،سنا ہے تیرا اور ابا کا جوروں کا ماسکہ چلا تھا،اور مجھے تو یہ بھی پتہ ہے کہ تو ابا کے ساتھ بھاگنے کو تیار تھی مگر عین وکھت پر تیرے ابا نے سب کام کھراب کردیا اور یہ تو ترک ترک کی رٹ محلے کی عورتوں تک ہی رکھ میرے سامنے نہ بول ہم اور تم ایک ہی برادری سے ہیں،نیچ جات ہندو تھے سکر کر کہ تیرا ابا اور میرا دادا مسلمان ہوگئے تو اجت کی روٹی مل رہی ہے ورنہ تو ابھی ہندوستان میں گوہ کی بالٹیاں سب ڈھور ہے ہوتے۔' کیسی بے سرم ہے کتنی تیج جبان ہے تیری۔۔۔۔ساس کچھ کمزور پڑ گئی تھی۔۔'مجھے تو لگے کہ ابا کے دماگ پر تو ہی سوار تھی جبھی تو میری جبان بھی تیری ہی طرح ہے۔۔۔وہ بے حیائی سے ہنستی ہوئی بالٹی میں بھرے بارش کے پانی کو چولہے پر چڑھاتی ہوئی بولی۔'تجھے یہ الٹی سیدھی کون بتاتا ہے؟ یہ سب جھوٹ ہے،ساس بھنا گئی تھی۔'پتہ نہیں ابا ہی بتا رہا تھا اور چھوٹی بیٹی ثنا کے رونے کی آواز پر لپکتی ہوئی بولی۔'توبہ ہے ،کیسی حرافہ ہے اپنا کصور چھپانے کے لئے سب پر الجام لگا رہی ہے،ارے کھاندان کیسے چلے گا۔۔۔ایک لڑکا تو جن نہیں پائی ساس حلق کی پوری قوت سے چلائی۔
تو اسمیں میرا کیا کصور ہے؟وہ بچی کو کمر پر ٹکائے کمرے سے نکلتی ہوئی بولی۔'تو اور کس کا؟ بچہ تو عورت ہی پیدا کرتی ہے،میں نے تین لڑکوں کو جنم دیا،اکبر کے بیٹیوں کے علاوہ ماسالا دو بیٹے ہیں اور ایک میرا بھوندو۔۔۔'تو کھالہ اکبر بھائی سے میری سادی کرا دیتی تجھے پوتے مل جاتے،'وہ تڑخی۔"بد جبان سرم نہیں آتی جیٹھ کے لئے ایسا بولتی ہے؟"ساس نے ڈانٹا ' سچ بولنے میں کیا سرم اور ہاں تو کونسا گلط کہتی ہوں،تیرے بھوندو میں مرد کا بیج ہی نہیں۔۔۔'ارے میرے بچے پر الجام لگا رہی ہے نامراد۔۔۔' ساس چلائی ،کھالہ نامراد تو تم ہوئیں،عورت ہو کر عورت کو کوس رہی ہو،یہ لڑکیاں تیری ہی تو ہیں'وہ صحن کے کونے میں لگے نل سے بچی کا منہ دھلاتے ہوئے بولی۔'ہاں ہاں آ کھر میرے بھوندو کی ہی اولاد ہیں۔۔۔وہ کچھ نرم پڑ گئی تھی۔۔میں تو بس یہ چاہوں کہ ایک لڑکا ہو جائے تو تیرے اور بھوندو کے بڑھاپے کا سہارا ہو جائے۔۔۔آ کھر لڑکیاں تو اپنے گھر کی ہو جاتیں ہیں، 'لڑکیاں تو رحمت ہوتی ہیں سبھی کہتے ہیں ،رجو ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔ہاں یہ بھی بارس کی طرح ہو ویں پکے مکان والوں کے لئے تو رحمت،ہمارے جیسے کچے گھر والوں کے لئے ہو تو مصیبت'وہ چولہے پر چڑھے پانی کی حرارت ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے بولی۔' کھالہ اب لڑکا لڑکی کی بات نہ کر،آجکل

لڑکیاں جیادہ آگے ہیں، دیکھ ٹی وی پر کتنی پیاری پیاری لڑکیاں آتی ہیں، اور اس دن یاد نہیں انورسٹی کی لڑکیاں ہمارے محلے میں آئی تھیں ہم سے بات چیت کرنے کوئی بھی تو لڑکا ان میں نہیں تھا' اُس نے یاد دلایا۔۔۔تو آ کھر کریں کیا؟ نہ سادی نہ بیاہ ماں باپ نے سوچا کہ سایداسی طرح۔۔۔ہائے بے چاریاں' رحمت بی بی کو ان پر بہت ترس آرہا تھا۔۔۔اور کھالہ بے نجیر بھی تو عورت تھی، ملک کی وجیر آجم بنی۔۔۔اُس نے اپنے چلتے ایسا پانسہ پھینکا تھا جو ساس کو خاموش کرانے کو کافی تھا۔ہا! جبھی تو ماردی گئی، مرد ہوتا تو مجال تھی کسی کی؟۔۔۔ اور رجو خاموش ہوگئی، مرد کی بات ہی اور اچھا جرا یہ پانی نہانے کو رکھ دے بڑی دیر میں گرم ہوا۔۔رحمت پوتی کو گود میں لیتی ہوئی بولی، یہ بینا کہاں ہے؟ اُس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑی پوتی کے بارے میں پوچھا۔اسے تو پھاتمہ بائی کے پاس ان کو پڑھنے بھیجا ہے، اسکول کی چھٹیوں میں کھالی گھر بیٹھ کر کیا کریگی وہاں کران (قران) کے ساتھ سلائی ٹکائی بھی سیکھ لے گی۔اسنے بتایا۔'اور کتنا پیسہ لے گی پھاتمہ؟ دس روپے مہینہ۔رجو پانی معدوم سے غسلخانے میں رکھتے ہوئی بولی۔ساس کچھ بولی تو نہیں مگر اسے غصہ تھا کہ ایک تو لڑکی کو اسکول میں داخل کرادیا گیا دوسرے ایک اور خرچہ، اسکا خیال تھا کہ اسکولوں میں بھیجنے سے لڑکیاں بدزبان اور بے لگام ہو جاتی ہیں، اسنے بڑی کوشش کی تھی کہ پوتی کو اسکول نا بھیجے لیکن رجو آڑے آگئی تھی' پتہ نہیں اس نے میرے بھوندو کو کیا گھول کر پلادیا ہے کہ اسکے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں وہ نہاتے میں بڑبڑائے جارہی تھی۔

موسم میں خنکی اتر آئی تھی، اس روز بھوندو وقت سے تھوڑا پہلے گھر پہنچا تو گھر کی فضا بدلی بدلی سی لگی، رجو چند عورتوں میں گھری بیٹھی تھی اور اسکی ماں سبکی خاطر داری میں لگی تھی۔"ارے بھوندو اد ہر آ جراسن، ماں نے پکارا، کھیر سے تو پھر باپ بننے والا ہے۔۔۔اور اس بار تو کھدا جرور سنے گا پوتا ہوگا پوتا، ماں کے منہ سے الفاظ جیسے ، گنگناتے، رقص کرتے بھوندو کی روح میں ہلکورے لینے لگے تھے۔ایک طرف اسے پوتے کی امید اور دوسری طرف اس بات کا اطمینان کہ یہ خبر کالونی کی ان عورتوں کے لئے تازیانہ تھی جو اکثر اسے اپنی بہوؤں کی کثیر الاولادی اور اولاد نرینہ کا فخر سے تذکرہ کرتیں، اور اسے مشورے بھی دیتیں کہ کسی پیر فقیر کے پاس رجو کو لیجائیں۔دیکھ رحمت، اس بار رجو کو اسپتال نہ بھیج اسکا بچہ میں جنواؤں گی، دیکھنا لڑکا ہوگا، پٹھانی بوا کے پہلے دو بچے میں نے جنوائے دونوں لڑکے ہوئے تیسری اور چوتھی بار اسپتال میں بچے ہوئے دونوں لڑکیاں۔رجو سن کر زور سے ہنس دی اچھا تو دائی کھالہ تیرے ہاتھ میں جادو ہے کہ ہاتھ لگادیا تو لڑکی لڑکا بن جاتی ہے؟ چل میرے پیٹ پر ہاتھ پھیر دے اگر لڑکی ہوئی تو لڑکا بن جائے گی اور اگر لڑکا ہوا تو؟؟؟؟ جوان مائیں اسکی منطق پر ہنس پڑیں دائی کے ماتھے پر بل آگئے، 'تو تو باؤلی ہے، اچھا اب میں چلوں رحمت کھدا کھیر سے تجھے پوتے کا منہ دیکھنا نصیب کرے، وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

" کیوں رجو تو نے بتایا نہیں،" رات میں جب وہ سونے لیٹا تو بیوی سے شکوہ کیا۔' لے مجھے کیا معلوم، آج ہی تو سویرے طبیعت کھراب ہوئی تو تیری اماں نے دائی کھالہ کو بلالیا تھا اسی نے بتایا۔ہوں، اچھا ایک بات کہوں؟ بھوندو بولا۔کہہ۔۔۔اسبار دائی

Scanned with CamScanner

کھالہ سے ہی کروالے اپنے میکے نہ جا۔ اسنے لجاجت سے کہا۔ ٹھیک ہے جیسا تو کہے وہ بولی۔ کتنا اچھا ہو کہ اس بار لڑکا ہو جائے، بھوند
کے دل کی بات کھل کر زبان پر آ گئی تھی۔ "ہاں جی تو میرا بھی چاہتا ہے، مگر میں نے ٹی وی پر سنا تھا کہ عورت کے لڑکا ہو یا لڑکی سب مرد
کی وجہ سے ہوتا ہے۔۔۔ 'اچ۔۔ چھا" مارے حیرت کے بھوندو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ہاں اور یہ بات تو ہماری بیگم صاحب نے بھی بتائی تھی،
جہاں ابا کام کرتا ہے تو تو جانتا ہے وہ ڈاگدرنی ہے۔ "رجو بولی، "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا! اسکی مردانگی تلملا اٹھی تھی۔ ہاں بیگم صاحب تو
کہتی ہیں کہ عورت تو گملہ ہوتی ہے، جیسا بیج پڑے گا ویسا ہی پودا ہوگا۔ اس نے انجانے میں ایک اور کچوکا لگا دیا تھا۔ "میرا تو
کھیال ہے جمین ٹھیک ہو تو پودا بھی اچھا ہوتا ہے، وہ بولا، رجو اسکی یہ بات سن کر تھوڑا حیران ضرور ہوئی مگر مسکرا کر بولی 'اب بھنڈی کے بیج
سے ٹماٹر تو نہیں ہوتے۔ 'اماں سا ید ٹھیک ہی کہتی ہے کہ رجو بڑے لوگوں میں رہنے سے ایسی ہو گئی ہے بالکل عجیب باتیں کرتی
ہے۔۔۔ وہ یہ سوچتا ہوا دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔۔۔ مگر ہے بہت اچھی۔۔۔ وہ مسکرا اٹھا۔ کیا سوچ کر مسکرا رہے ہو؟؟ رجو نے پوچھا۔
کچھ نہیں بس تیرے ہی بارے میں سوچ رہا تھا کہ تو کتنی اچھی ہے۔۔۔ رجو! اسبار تو مجھے بیٹا دیدے، اسکے لہجے میں لجاجت تھی۔ اور رجو
نے اس ایسی نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو، تو رہا بھوندو کا بھوندو ہی!

رجو دو تین دنوں کے لئے میکے آئی ہوئی تھی اور اس وقت بنگلے میں بیگم صاحب کے پاس بیٹھی تھی، وہ چاہ رہی تھیں کہ رجو زچگی
کے لئے ادھر ہی آ جائے لیکن اسنے بتایا کہ اسکا شوہر اور ساس اس بار دائی سے کیس کرانا چاہ رہے تھے۔ اور جب بیگم صاحب نے وجہ
پوچھی تو اسنے بتایا کہ اسکی ساس اور شوہر سمجھتے ہیں کہ دائی کے ہاتھوں لڑکا ہو سکتا ہے اور بیگم صاحب زور سے ہنس پڑیں۔ "تو رضیہ سلطانہ تم
بھی یہی سمجھتی ہو؟؟؟ میرا تو کھیال ہے کہ اس بار بھی لڑکی ہی ہوگی، اسنے انکی بات پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے یقین سے کہا۔ وہ کیسے؟
اسکی ماں نے پوچھا" ایسے اماں بھی ایسا ہی لگ رہا ہے، لڑکا ہوتا تو پیٹ میں وہ اودھم مچاتا کہ پٹھانی کھالہ کی بہو کی طرح بستر پر پڑ جاتی! او
بولی۔ خیر میرا مشورہ اب بھی یہی ہے کہ تم دائی وائی کے چکر میں مت پڑو تاریخ سے دو تین دن پہلے ادھر آ جانا۔ بیگم صاحب اٹھتے ہوئے
بولیں۔ رجو خاموش رہی۔ بیٹے کی امید میں بھوندو اور اسکی ماں کی عنایتیں رجو پر بہت بڑھ گئی تھیں، دونوں اسکی ہر ہر چیز کا خیال رکھتے،
بھوندو نے تو اسے موبائل فون بھی لا کر دیدیا تھا اگر کبھی بازار سے کچھ کھانے کو جی چاہے تو بس بٹن دبا دے اور اسکو بتا دے۔ بھوندو کو ہر
سال کی طرح اس بار بھی ٹھٹھہ جانا تھا فیکٹری کے مالک کے آم کے باغ سے مال لدوا کر شہر لانا تھا۔ "رجو ٹھیک سے کھانا پینا اور کوئی بات
ہو تو مجھے فون کر دینا، اسنے کہا، تو پھکر نہ کر کھالہ تو ہے اور اماں بھی دو ایک دن میں ادھر آ جائے گی اسنے شوہر کو تسلی دی۔

اس بار بھی رجو کے بیٹی ہی ہوئی، گلابی سی پیاری سی رجو تو اسکی شکل دیکھ کر اپنی سب تکلیف بھول گئی تھی اور دائی مرے لہجے میں
رحمت کو مبارکباد دیکر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ " کیوں جگن دائی تو تو کہے تھی کہ لڑکا جنوائے گی۔۔۔ رحمت نے تیز لہجے میں کہا۔
"اب میں کیا کروں تیری کسمت میں ہی نہیں" وہ سارا الزام قسمت پر ڈالکر گھر سے باہر نکل آئی۔ دوسرے دن کئی عورتیں، کچھ مبارکباد

Scanned with CamScanner

دینے اور کچھ رحمت کا ردعمل دیکھنے آئی ہوئی تھیں، فاطمہ بائی بھی مٹھائی لیکر آئی۔" لڑکا ہوتا تو تو۔۔۔کھیر ہے تو میری ہی پوتی۔۔۔رحمت نے نہ جانے کیا کہتے کہتے خود کو روک لیا، مگر ایک اداسی اسپر چھا گئی تھی۔اسی وقت بھوندو سامان سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوا، وہ خاموش بیٹھی عورتوں اور ماں کے اترے چہرے کو دیکھکر پریشان ہوگیا، "اماں سب ٹھیک تو ہے نا؟ رجو کیسی ہے؟ اسنے گھبرا کر ماں سے پوچھا۔" اسے کیا ہونا ہے، اسبار بھی اسنے لڑکی جنی ہے" ماں جیسے پھٹ پڑی، اور وہ بے دم سا ہو کر وہیں زمیں پر بیٹھ گیا، اسکے سارے خواب، سب امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔وہ کافی دیر تک اسی حال میں بیٹھا رہا، فاطمہ نے تسلی دی، دوسری عورتوں نے دلاسے دیئے مگر وہ جیسے بہرا ہو گیا تھا۔" ارے سب ایسے بول رہے ہیں جیسے گھر میں خوشی نہیں موت آئی ہے؟ رجو نہ جانے کب کمرے سے نکل کر آ گئی تھی۔۔۔" ارے ابھی کل ہی تو۔۔۔اے کھالہ چپ رہو کچھ نہیں ہوتا مجھے اور تو بھوندو بڑا مرد بنا پھرتا ہے ارے ایک لڑکا مجھے نہیں دے سکتا تھا؟ دفع ہو جا۔۔وہ شوہر پر برس پڑی تھی سب عورتیں منہ کھولے یہ منظر دیکھ رہی تھیں، مرد ہے تو مردوں والا کام کر اور نکل جا یہاں سے۔۔۔ہائے بھوندو تجھے اپنے اور میرے بڑھاپے کا بھی کھیال نہ آیا۔۔۔وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اور بھوندو گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

کئی برس بیت گئے سنا ہے بھوندو اپنی تینوں لڑکیوں کے گرد پروانے کی طرح چکر لگاتا رہتا ہے، محلے بھر میں بڑے فخر سے تینوں لئے لئے پھرتا ہے اور رضیہ سلطانہ بڑے بڑے ناز اور فخر سے اپنی ہم چشموں میں گردن تان کر اعلان کرتی رہتی ہے کہ اصل مرد تو میرا انور ہے انور!!!!

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

شاہ محمد کا ٹانگہ

علی اکبر ناطق

میں دیر تک بوسیدہ دیوار سے لگا اُسے دیکھتا رہا، جس کا ایک حصہ زمین میں دھنس چکا تھا اور دوسرا اُس سوکھے درخت کے ساتھ سہارا لیے تھا جس کے ٹنڈ منڈ تنے پر کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ کچھ راہ گیر سلام دعا کے لیے رُکے لیکن میری توجہ نہ پا کر آگے بڑھ گئے۔ مجھے اس لکڑی کے پہیے اور بمبو کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے نے کھینچ کر اچانک تیس سال پیچھے لے جا پھینکا۔

لے بھئی جوان، شاہ محمد نے اپنے چھانٹے کی لکڑی تانگے کے پہیے سے ٹکراتے ہوئے بات شروع کی، اُس وقت جوانی مجھ پر پھوٹی پڑتی تھی اور خون تازہ تھا۔ بس ٹویٹا کار کارخانے سے نکل کر آئی ہی تھی کہ میں نے خرید لی۔ (چھانٹا پھر گھومتے ہوئے پہیے کے ساتھ لگا دیا جس کی رگڑ سے گڑ رر رگڑ رر رر کی آواز پیدا ہوئی اور گھوڑا مزید تیز ہو گیا) اور لگا ممبئی کی سڑکوں پر دوڑانے۔ اُن دنوں کار پر سواری بٹھانا شرم کی بات تھی۔ اس لیے اکیلا ہی گھومتا۔ ممبئی کے رش کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔ لیکن میں نے کہا، شاہ محمد ابات جب ہے جب تُو کار بھری سڑک پر ہوا کی طرح چلائے۔ پھر تو تھوڑے ہی دنوں میں سرکس والوں کو پچھاڑنے لگا۔

تو کیا چاچا آپ کار لے کر سرکس میں کام کرنے لگ گئے تھے؟ مَیں نے حیران ہوتے ہوئے سوال کیا۔

او میرے بھتیجے (شاہ محمد نے گھوڑے کو چھانٹا مار کر اُسے مزید تیز کر دیا) سرکس والی بات تو میں مثال دینے کے لیے کر رہا ہوں۔ میرا اُن مداریوں سے کیا تعلق۔ وہ بچارے تو پیٹ بھرنے کے لیے یہ دھندا کرتے تھے۔ اِدھر تجھے تو پتا نہیں، پر اللہ بخشے تیرا ادا میرے باپ کو جانتا تھا۔ ہم پُرکھوں سے نواب تھے۔ لاکھوں ہی روپے ان ہاتھوں سے کھیل تماشوں میں جھونک دیے۔ خیر چھوڑ ان باتوں کو۔ بات میری نئی کار کی ہو رہی تھی۔ ممبئی کی سڑکوں پر دوڑاتے دوڑاتے پورا سپرٹ ہو گیا اور حد یہ ہوئی کہ چلتے ہوئے بڑے ٹرکوں کے نیچے

Scanned with CamScanner

سے گزارنے لگا

اب میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے شدید حیرانی سے پوچھا، وہ کیسے چاچا؟

ہاہاہا، شاہ محمد نے مونچھ پر ہاتھ پھیر کر گھوڑے کو برابر تھپکی دی اور بولا، جوان یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آسکتی (اُس وقت میں گیارہ سال کا جوان تھا) بس تو چپ کر کے سنتا جا۔ ایک دن عجیب ہُوا، مَیں کار میں جا رہا تھا کہ سڑک کنارے ایک آدمی نڈھال اور بُرے حال میں زخمی کھڑا تھا۔ پیچھے اُس کے پولیس والے مارتی ہوئی چڑھی آ رہی تھی۔ مَیں نے سوچا، بچارا مارا جائے گا۔ کچھ خدا ترسی کر دے۔ اُسی لمحے میں نے کار اُس کے پاس لے جا کر کھڑی کی اور کہا بھئی جلد بیٹھ جا۔ لو جی اُدھر وہ کار میں بیٹھا، اُدھر میں نے ریس دبا دی (گھوڑے کو ایک اور چھانٹا)۔ اب پیچھے پولیس اور اُس کی ہوٹریں اور آگے مَیں۔ وہ بندہ بہت گھبرایا کہ ابھی پکڑے۔ اب اُس بھڑ بھوسیے کو تو نہیں پتا تھا، وہ کس کے ساتھ بیٹھا ہے لیکن میں مطمئن۔ (میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) مجھے تو پتا تھا، بچاری پولیس ہمارا کیا مقابلہ کرے گی۔ اب ممبئی کی سڑکیں تھیں، ہماری کار تھی اور پولیس کی دس گاڑیاں۔ مَیں نے چلتے چلتے پوچھا، بھائی کیا تماشا کر کے بھاگے ہو، جو اتنے غنڈے پیچھے لگا لیے؟ بڑے تحمل سے بولا، میاں، سیٹھ بھیم داس کھتری کی تجوری لوٹی ہے۔ میرے تو ہوش کی ایسی تیسی پھر گئی۔ او تیرے مُردوں کی خیر۔ بھیم داس کھتری کروڑوں کا مالک۔ میں نے پوچھا، لیکن تم تو خالی ہاتھ ہو؟ بولا، ابھی چندرا کھیم کے پُل نیچے پھینک آیا ہوں۔ بس ایک دفعہ ان لفنگوں سے جان چھڑا دو، تمھیں مالا مال کر دوں گا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا کہ یہ کون ہوتا ہے ہم نوابوں کو مالا مال کرنے والا؟

(اتنے میں ایک بکریوں کا ریوڑ سڑک سے گزرنے لگا۔ جس کی وجہ سے شاہ محمد کو گھوڑے کی لگامیں کھینچنا پڑیں) اسی کی ساتھ اُس کی داستان بھی رُک گئی اور بدمزگی سے بولا، یار یہ ایالی لوگ بھی خدا جانتا ہے زلزلے کی گھڑی پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں سے گزرتے ہیں ہر چیز کا ناس پھیر دیتے ہیں۔ سڑکیں تو اِن کے باپ کی ہوتی ہیں جو اپنے نام لکھوا لیتے ہیں۔ دیکھ، کس سکون سے کاپا کاندھے پر رکھے اکڑتا جا رہا ہے۔ جیسے نادر شاہ کا سالا ہو۔ (ایالی کو آواز دیتے ہوئے) او بھائی جلدی کر، گھوڑا بدکتا ہے، بھیڑوں کو جلدی ہانک۔ لیکن ایالی نے گویا شاہ محمد کی آواز سُنی ہی نہیں۔ اُسی بُردباری سے سڑک کے درمیان چلتا رہا۔ شاہ محمد پر یہ دورانیہ صدیوں پر محیط ہو گیا مگر انتظار کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ قصہ سننے کی بے چینی مجھے بھی تھی لیکن میری کیفیت میں ذرا اطمنان تھا۔ خیر خدا خدا کر کے تانگے کے گزرنے کا رستہ بنا تو شاہ محمد نے دوبارہ گھوڑے کو چابک دکھایا۔ گھوڑے نے چال پکڑی تو میں نے کہا، چاچا پھر آگے کیا ہوا؟

یار اس ایالی نے بات کا مزا ہی ہوا کر دیا۔ خیر، تو بھائی میں کہہ رہا تھا، مجھے اُس دمڑی گیر کی بات پر بہت غصہ آیا لیکن یہ سمجھ کر پی گیا کہ نا سمجھ ہے، جانے دو۔ عین اُسی لمحے ہمارے سامنے بہترانچ کے پہیوں والے دو ٹرک آ گئے۔ ایک دائیں سے، ایک بائیں سے۔ اب کیا تھا، پیچھے پولیس، آگے دو ٹرک اور سڑک تنگ۔ مَیں نے کہا، لے بھئی شاہ محمد یہی وقت ہے عزت بچانے کا۔ اب پرائی

Scanned with CamScanner

مصیبت سر پر لی ہے تو اُسے بھگت بھی اور کھیل جا جان پر۔ لو جی، میں نے فوراً ہی فیصلہ کیا۔ اُسے کہا، کا کا مضبوط ہو جا اور بلٹر تی سے کار کو ایک ٹرک کے نیچے سے گزار کر سڑک کے دوسری طرف ہو گیا۔ لیکن دیکھا تو آگے سڑک ہی نہیں تھی۔ لمبی اور گہری کھائی تھی۔ میں نے ایک ہی دم ہینڈل کو جو دوسری طرف گھمایا، کار دائیں جانب کے دو پہیوں پر ہو گئی۔ اب وہ کھائی سے تو بچ گئی لیکن سکوٹر کی طرح ایک طرف کے پہیوں پر ہی دوڑتی گئی۔ (قہقہہ مارتے ہوئے) بھائی وہاں تو اچھا خاصا تماشا بن گیا۔ لوگ بھاگ کر سڑک کے کنارے جمع ہو گئے (گھوڑے کو چھانٹا ہوا میں لہرا کر ڈرایا)۔ میں نے سوچا، ہماری تو جان پر بنی ہے اور انہیں دیکھنے کو کھیل مل گیا۔ اب گاڑی کی سپیڈ تھی ڈیڑھ سو سے اوپر۔ اگر اُسی وقت چار پہیوں پر کرتا تو فوراً الٹ جاتی۔ میں نے سوچا، اسے اسی طرح جانے دو۔ وہ بھڑوا ایک دو دفعہ بولا، بھائی اسے سیدھی کر لو ورنہ مر جائیں گے۔ مَیں نے فوراً ڈانٹ دیا، نالائق چپ رہ، جس کام کا پتہ نہیں درمیان سے نہیں بولتے اور کار کو ایک میل تک اسی طرح دو پہیوں پر رکھا اور بھوٹ کی طرح نکل گئے۔ جوان، کیا زمانے تھے۔ اور ایک یہ دن ہیں ایالی، رستہ نہیں دیتے۔ شاہ محمد کی بات جاری تھی کہ گاؤں آ گیا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا، لے بئی جوان باقی قصہ کل پر۔ مَیں چھلانگ مار کر تانگے سے نیچے اُتر گیا۔

اسلامیہ ہائی سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی مَیں وینس چوک عبور کر کے تانگوں کے اڈے پر آ جاتا اور شاہ محمد کے تانگے پر براجمان ہو جاتا۔ تانگہ خالی ہونے کی وجہ سے مجھے اڈے پر ہی کافی دیر بیٹھنا پڑتا۔ چار کنال رقبے پر محیط اڈے کی چھت سرے ذرا ہی اونچی تھی۔ گرمیوں میں ستونوں کے ساتھ سیبے کی بوریاں لٹکا کر اُن پر پانی چھڑک دیا جاتا کہ ہوا ٹھنڈی ہو کر گھوڑوں کو لگے اور لو پیدا نہ ہو۔ اس کیفیت میں یہ ایک نہایت خاموش اور پُرسکون سرا معلوم ہوتی تھی، جس میں کبھی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آ جاتی اور بس۔ چاروں طرف تین چار ہوٹلیں تھیں۔ ہوٹل والوں نے وی سی آر بھی رکھے تھے۔ جن پر انڈین فلمیں چلتیں۔ کوچوان تیز پتی کی چائے کے ساتھ فلمیں دیکھتے۔ یوں تو صفائی کا خیال رکھا جاتا لیکن لید کی ہلکی بو اس طرح اُن میں بسی تھی کہ اجنبی کے فوراً ناک کو چڑھ جاتی مگر کوچوانوں، ہوٹل والوں اور پڑوس کے رہائشیوں کے لیے اسی لید کی بُو میں ذہنی آسودگی تھی۔ وہ چائے یا کھانا کھانے کے ساتھ اس بُو کی لذت کو بھی محسوس کرتے۔ چنانچہ انہیں دوسری جگہ چائے پینے کا لطف نہ آتا تھا۔ ہوٹلیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی، نہایت تنگ، نیچی چھتوں والی۔ فرش زمین کی سطح سے دو دو فٹ نیچے اُتر چکے تھے۔ دیواروں اور چھتوں پر دھوئیں کا گاڑھا پلستر اس طرح چڑھ چکا تھا کہ اب وہاں جیسی بھی تیز روشنی کی جاتی وہ اندھی اندھی محسوس ہوتی۔ مٹی کے تیل سے جلنے والے چولہوں کا دھواں ہر نئے دن اُس میں اضافہ کر جاتا۔ دیواروں پر ہیما مالنی، دلیپ کمار اور پتا نہیں کن کن اداکاروں کی تصویریں تھیں، جن کے اوپر ذرا بلندی پر قرانی آیتیں، عبدالقادر جیلانی اور دیگر ولیوں کے پوسٹر بھی آویزاں تھے۔ ان سب کو دھوئیں نے بغیر کسی تمیز کے کالا کر دیا تھا۔ ہوٹل کا مالک اُنہیں لگا کر بھول چکا تھا اور یہ بھی

Scanned with CamScanner

نہیں سوچا کہ کم از کم مسلمان پوسٹروں سے دھویں کی تہیں ہٹا دے۔ یہ سب کوچوان مضافاتی گاؤں سے سواریاں لا کر شہر میں چھوڑ دیتے اور تانگہ بھرنے تک یہیں رہتے۔ اڈے میں بیس پچیس تانگے ہر وقت کھڑے رہتے اور گھوڑے تھان سے بندھے ہرا لوسرن یا دانہ کھانے میں مگن۔ کچھ سائیس لوگ گھوڑے سر نیچا کیے مراقبے میں رہتے حتیٰ کہ کوچوان اُنہیں دوبارہ تانگے میں جوت دیتے۔ تھان کے ساتھ بیس فٹ پانی کا حوض بھی تھا۔ جس طرح کوچوان آپس میں واقف تھے، اسی طرح گھوڑے بھی ایک دوسرے سے جان پہچان رکھتے تھے۔ جب ایک گھوڑا سواریاں لے کر رخصت ہونے لگتا تو ساتھ والا اپنی کٹوتیاں اُٹھا کر مدھم سا ہنہناتا، جیسے الوداع کہہ رہا ہو۔ شاہ محمد ہمارے گاؤں کا تھا۔ میرا اُس سے تعارف تب ہوا جب چھٹی جماعت کے لیے مجھے شہر کے اسکول میں داخل کرایا گیا اور اُسی کے تانگے پر میرا آنا جانا ٹھہر گیا۔ سکول جاتے اور وہاں سے شاہ محمد کے ساتھ واپس آتے مجھے اب کئی مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران اُس نے اپنی زندگی کے کئی ایسے واقعات سنائے جو حیران کن تھے۔ ہر واقعہ کسی بڑے شہر میں اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ کب ان شہروں میں پھرتا رہا؟ اس بات سے سب نہ واقف تھے۔ پچھلے پندرہ سال سے تو وہ اسی اڈے پر تانگہ چلا رہا تھا۔ البتہ واقعات ایسی دلاویزی سے سناتا کہ اُس کی بات پر یقین کرتے ہی بنتی۔ شاہ محمد بمبو کے ساتھ لگی اُس تختی پر بیٹھتا جو ہر تانگے میں اسی مقصد کے لیے لگائی جاتی ہے۔ سیٹ پر اُسے کبھی کبھار ہی بیٹھنا نصیب ہوتا۔ لیکن مجھے اُس وقت شدید غصہ آتا جب سواریوں کے زیادہ ہو جانے کی وجہ وہ مجھے بھی بچہ سمجھ کر ہودے میں بٹھا دیتا۔ مگر چند ہی لمحوں میں جب کہانی شروع کرتا تو مجھے اپنی بے عزتی کا احساس نہ رہتا۔ یہ میرا شہر میں پہلا سال تھا جو دوسرے سال کے آخر تک اسی دلفریب یکسانیت سے چلا۔ مگر تیسرے سال میرے پَر نکل گئے اور مَیں نے گھر میں سیاپا ڈال کے ایک سائیکل خرید لی۔ پھر میٹرک تک اُسی سائیکل پر رہا جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ سارے شہر کی گلیاں ناپتا۔ خاص کر بہار کے دنوں میں سائیکل پر سوار ہو کر سڑک کے کنارے درختوں کے سائے سائے پھرنا مجھے جنت کی سیر کے برابر لگتا۔ کمپنی باغ، پہلوانوں کا باغ، اسٹیڈیم اور دوآبہ نہر سے لے کر ہیرا منڈی کی سیر تک سب کا کریڈٹ میری سائیکل ہی کو جاتا ہے۔ میرا رُخ کبھی کبھار ہی ٹانگوں کے اڈے کی طرف ہوا، وہ بھی کسی کام کی صورت میں۔ مثلاً ایک دفعہ گھر والوں نے کہا، چارپائیوں کا بان لیتے آنا۔ چنانچہ بان خریدنے کے لیے مجھے اسی طرف آنا پڑا کیونکہ ہر قسم کے بان کی دوکانیں ادھر ہی تھیں۔ اگلے سال یعنی میٹرک پاس کرتے ہی میں نے گاؤں کو خیر باد کہہ دیا اور شہر میں دوستوں کے ساتھ رہنے لگا۔ اس صورت میں میرا تانگے کے ساتھ وہ تعلق بھی ختم ہو گیا جو کبھی گاؤں آتے یا شہر جاتے سائیکل کی دوڑ تانگے سے باندھ لیتا تھا۔ اگلے دو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی شاہ محمد سے آمنا سامنا ہوا اور یہ سال اتنی تیزی سے نکل گئے کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ میں نے ایف اے کر لیا۔ اب بی اے کے لیے لاہور چلا آیا۔ اب میں تین چار مہینے بعد گھر جاتا لیکن اس سفر میں بھی شاہ محمد کے تانگے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ کیونکہ گاؤں دو شہروں کے درمیان رابطہ سڑک سے تین کلومیٹر ہٹ کے تھا۔ اب اس رابطہ سڑک پر بہت زیادہ بسیں چلنا شروع ہو گئیں جو پہلے دو تین ہی چلتیں تھیں۔ یہاں بھی گاؤں کے کچھ تانگے کھڑے ہوتے جو بس سے اُترنے والی سواریوں

کو گاؤں لے جاتے۔ میں بس سے اُتر کر انہی تانگوں کے ذریعے گاؤں جانے لگا۔ شاہ محمد اس عرصے میرے منظر سے دور رہا اور دو سال مزید گزر گئے۔ اگلی دفعہ گاؤں گیا تو بہار کے دن تھے۔ درختوں کی شاخوں پر ہری ہری کونپلیں دل میں تازگی بھر رہی تھیں۔ اس بار میرے دل میں خواہش جاگی، کیوں نہ آج شاہ محمد کے ساتھ سفر کیا جائے۔ مَیں اپنے مقامی شہر سے گاؤں جانے کے لیے سیدھا تانگوں کے اڈے کی طرف چلا گیا۔ لیکن اڈے میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ وہاں چار چھ تانگوں کے علاوہ باقی سب رکشے تھے اور شور اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھٹے سائیلنسروں اور گڑگڑ کرتے انجنوں کی وجہ سے اڈے کی چھت اُڑی جاتی۔ اس بدہنگم مخلوق کے درمیان بچارے گھوڑے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ ہر چیز جلدی سے بدل رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بیٹھ سا گیا۔ مَیں کچھ دیر بدحواس کھڑا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا، شاہ محمد اپنے تانگے کے ساتھ ابھی بھی یہاں ہوگا۔ مَیں اڈے میں اکا دُکا تانگوں کا جائزہ لینے لگا اور چند ثانیوں بعد ہی شاہ محمد کے تانگے پر نظر جا ٹھہری جس کی ایک ایک پتری مجھے ابھی تک یاد تھی۔ اب اُس کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی، پھر بھی پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی البتہ گھوڑا وہ نہیں تھا۔ تانگے کو دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ اب میں سیدھا اُس ہوٹل کی طرف بڑھا جہاں میرے خیال میں شاہ محمد کو ہونا چاہیے تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی شاہ محمد کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ ایک دم اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ زور زور سے گلے ملنے لگا جیسے مدتوں کا بچھڑا ہوا ساتھی ہو۔

بھتیجے کہیں دور ہی نکل گئے ہو، کیا تم نے سمجھ لیا تھا، شاہ محمد مر گیا؟ مان لیا بڑے شہری بابو بن گئے ہو پر بندہ کبھی حال چال ہی پوچھنے کو آ جائے۔ آدمی کو اپنے زندہ ہونے کا احساس رہتا ہے۔ ہم بھی بڑے بڑے شہروں میں رہے ہیں پر تُو تو پتر منہ دکھانے سے بھی گیا۔ کئی بار سنا کہ تُو گاؤں آیا اور بغیر ملے چلا گیا۔ مَیں سوچتا تھا بھتیجا ایسا تو نہیں پھر نہ جانے کیا بات ہے؟

شاہ محمد بول رہا تھا اور میں شرمندگی سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ مَیں نے جان چھڑانے کے لیے کہا، چاچا باقی باتیں بعد میں کر لینا اور جو چاہے کہہ لینا پہلے باہر نکل کے گھوڑے کے ساز کس، تاکہ گاؤں چلیں۔ گلے شکوے تانگے میں کریں گے۔

چائے تو پی لے، شاہ محمد نے چائے والے کو للکارا، بھائی ایک کڑک دودھ پتی بنا دے، آج بڑی مدت بعد بھتیجا اڈے پر آیا ہے۔

نہیں چاچا، چائے تجھے پتا ہے، میں پیتا نہیں، مَیں نے منع کرتے ہوئے کہا

او بیٹھ جا پتر، شاہ محمد نے اس ملگجی روشنی میں مجھے زبردستی لکڑی کے بنچ پر بٹھاتے ہوئے ہوٹل والے کو دوبارہ للکارا۔

اڈے سے باہر نکلتے ہی شاہ محمد نے دوبارہ شکائتیں شروع کر دیں جنہیں مَیں کچھ دیر خاموشی سے سنتا رہا بالآخر بولا، چاچا، دنیا کے دھندوں میں وقت کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ خدا جانتا ہے، بہت دفعہ آپ کی طرف آنے کا ارادہ باندھا مگر وقت نہیں ملا۔ آج سوچا کچھ بھی ہو جائے، چاچے شاہ محمد کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ بہر حال تانگے کی بتا، کیسا چل رہا ہے؟ مَیں تو اڈے کی حالت دیکھ کر پریشان سا ہو گیا ہوں۔

Scanned with CamScanner

بیٹے کیا پوچھتے ہو اڈے کا؟ شاہ محمد کا لہجہ اچانک فسردہ ہو گیا، خدا غارت کرے ان پھٹ پھٹیوں کو۔ اڈا تو ایک طرف، پورے شہر کا ناس مار دیا انہوں نے۔ اللہ جانے کس شیطان نے پہلے پہل سکوٹر کے پیچھے لوہے کا پیپا باندھ کر اس چڑیل کو بنایا تھا۔ اب جدھر دیکھو، یہی شیطانی ڈبہ دڑ دڑاتا پھرتا ہے۔ اس کی وجہ سے قسم لے لو میرے کان اب بالکل گونگے ہو گئے۔ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ پٹرول اور دھویں کی بدبو ایک طرف، تلی اور کلیجے تک کالک کی تہیں چڑھ گئیں۔ ان کی وجہ سے پورے شہر پر، وہ جو کالی دیوی کے بارے میں سنتے تھے، اُس کا سایہ پھر گیا ہے۔ صفائی اور سکون تو غارت ہوا سو ہوا، جان کا خطرہ الگ سے ہے۔

جان کا اس میں کیا خطرہ ہے؟ مَیں نے شاہ محمد کو مزید ہلایا۔

لو بھئی تم جیسے انجانے ہو، شاہ محمد نے اب کے مزا لیتے ہوئے بات شروع کی، روز ان کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ بندہ اچھا بھلا گھر سے نکلا لیکن ملا ہسپتال سے۔ سبب پوچھو تو سکوٹر رکشے کا نام لے کر چپ ہو جاتا ہے۔ ابھی جا کے دیکھو، بڑے ہسپتال میں آدھے اسی بلا کے مارے پڑے ہیں۔

اتنے ایکسیڈنٹ کیسے ہوتے ہیں؟ میں نے شاہ محمد کی بات کو ہنسی میں اُڑانا چاہا۔

شاہ محمد اب پورے تضحیک آمیز لہجے میں بولا، وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کو ڈھنگ سے سائیکل نہیں چلانی آتی، اُسی نے یہ بیماری خریدی اور لگا سواریوں کی ہڈیاں توڑنے۔ کسی کا ٹائر کھل گیا، کسی کا زنجیر ٹوٹا اور پڑا سڑک کے بیچ بکھر کے۔ بھئی بعض دفعہ تو اللہ معاف کرے، دیکھ کے مزا ہی آ جاتا ہے۔ اکثر تو ان کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میرا اپنا گھوڑا بدک گیا۔ اب تو کم بخت سکول سے بھاگے ہوئے بارہ تیرہ سال کے چھوکروں نے بھی، جن کے ابھی منہ چٹانے کے دن ہیں، یہ پھٹ پھٹیے جوت لیے۔ ایک وہ دن تھے جب لاہور میں ہم سکوٹر چلاتے تھے تو دس دس کاروں کے اوپر سے نکال لے جاتے تھے۔ یوں جیسے ہوائی جہاز اُڑتا جا رہا ہو۔

شاہ محمد نے پُرانی عادت کے موافق داستان کا پہلو نکال ہی لیا۔

وہ کیسے؟ میں نے تجسس ظاہر کیا۔

تانگہ اب شہر سے نکل کر کھلی سڑک پر رواں ہو چکا تھا۔ شاہ محمد نے گھوڑے کو ایک چھانٹا دکھایا اور بات شروع کر دی،، ایک دن میں سکوٹر پر ہی تھا۔ سکوٹر بھی نیا نکور زیرو میٹر۔ بس ہاتھ کے اشارے سے اُڑتا تھا۔ مَیں رواروی میں جا رہا تھا کہ سامنے سے دس بارہ لڑکے سکوٹر دوڑاتے آئے اور اگلے پہیے ہوا میں اُٹھاتے ہوئے دنا دن کر کے پاس سے نکل گئے۔ مجھے لگا لڑکے مجھے چھیڑ کے نکلے ہیں۔ بس اُسی وقت میرا بھی میٹر گھوم گیا اور میں نے کہا، لے بئی شاہ محمد تُو بھی دکھا دے ان کو اپنے جلوے۔ میں نے اُسی وقت اپنا سکوٹر واپس پھیرا اور پل کی پل میں لڑکوں کو جا لیا اور للکارا، لو بھئی اگر تم میں کوئی اپنے باپ کا صحیح نطفہ ہے تو آئے میرے برابر۔ بس پھر اُسی وقت دوڑیں لگ گئیں اور سکوٹر ہوا سے کھیلنے لگے۔ (ہنستے ہوئے) حرامی وہ بھی پورے دنوں کے تھے،۔ مجھے اِدھر اُدھر سے کٹیں مارنے لگے

۔کوئی آگے سے کوئی پیچھے سے۔وہ تو چاہتے تھے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیں۔اِدھر میں بھی اُن سے بچتا ہوا تیزی سے کٹیں مارتا جاتا تو
یہ سمجھو ہم اُس وقت عزرائیل کے چاچے بنے ہوئے تھے۔راہ گیر کی کیا حیثیت، ہمارے آگے بیل آجاتا تو مارا جاتا۔اس شیطانی دوڑ کی
سے ایک ہی دفعہ پورے فیروز پور روڈ کی ٹریفک کناروں سے لگ گئی۔بھاگم بھاگ میں اچانک مسلم ٹاؤن کی نہر آگئی۔اب خدا کی
ایسا کہ اُس کا پُل بن رہا تھا جس کی وجہ سے وہاں کئی مشینیں اور مزدور سڑک روکے کھڑے تھے۔مزدور تو ہمیں دیکھ کر بھاگ نکلے، پر مشینیں
کدھر جاتیں؟ اُنہیں دیکھ کر سب لڑکوں نے اپنے سکوٹر روک لیے لیکن میں نے دل میں کہا، شاہ محمد تیرا یہاں رُکنا توہین ہے۔بس پھر میں
نے ایک ہی دم سکوٹر کو دائیں ہاتھ پھیر کے جو ریس دبائی، سکوٹر نہر کے اُوپر سے اُڑتا ہوا نکل گیا۔اُڑتے ہوئے میں ہاتھ ہلا کر انہیں
اشارے کرتا گیا کہ بیٹا اب آؤ اگر تم میں جرأت ہے۔بس میں نکل گیا اور وہ بچارے اپنا منہ بغلوں میں چھپا کر وہیں رہ گئے، اور اب ایک
یہ رکشے والے ہیں جو گدھی ریڑھی چلانے کے لائق بھی نہیں لیکن میرے گھوڑے کو بدکانے سے باز نہیں آتے۔بس میاں قیامت کے
قریب آگئے۔

اگر ان کے اتنے ہی ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں تو سواریاں ان کے ساتھ بیٹھتی کیوں ہیں؟ مَیں نے پوچھا

میاں نئے زمانے کو عقل ہوتی تو یہ سکوٹر کے پیچھے ڈبہ باندھتی؟ شاہ محمد نے کہا، بھائی اگر جاپان والے آکر دیکھیں کہ
لفنگوں نے اُن کے سکوٹروں کا کیا حال کر دیا ہے تو وہ خدا کی قسم اِن پر ضرور عدالت میں ہتک کا مقدمہ کر دیں۔اب بتاؤ یہ کوئی انصاف ہے
؟ جو چیز ایک بندے کے لیے بنائی گئی تھی اُس پر بیس چڑھا دو۔بس اس ملک کے لوگ گھاس کھاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے دماغ
میں گوبر جمع ہو گیا گوبر۔

یہ تو چاچا بڑی خطرناک بات ہے۔کیا تم سب کوچوانوں نے احتجاج نہیں کیا ان رکشوں کے خلاف؟ مَیں نے تشویش
ظاہر کی، ایسا نہ ہو کل کلاں یہ سارے اڈے پر ہی قابض ہو جائیں۔ان کو چاہیے تھا، اپنے پھٹ پھٹیوں کے لیے کسی دوسری جگہ اڈا
بناتے۔

لو،، جوان کیسی باتیں کرتے ہو؟ اول تو کئی کوچوانوں نے گھوڑے بیچ کر یہی خرید لیے۔اب وہ اپنے ہی خلاف احتجاج
کیسے کریں۔دوم، جو رہی سہا گن اُسی کا پاؤں بھاری۔سواریاں اب تانگوں کی طرف منہ پھیر کر بھی نہیں دیکھتیں۔جس کی وجہ سے ہا
زور ٹوٹتا جا رہا ہے اور نوبت یہ آگئی کہ ہفتہ پہلے ہی کمیٹی والوں نے کوچوانوں کو اُلٹا دو مہینے کا نوٹس بھیج دیا ہے کہ تانگے اڈے میں زیادہ جگہ
گھیرتے ہیں اور لید کی بُو بھی آتی ہے۔اڈا رکشوں کو الاٹ کر دیا گیا ہے اس لیے اپنا ٹھکانا ڈھونڈو۔گھوڑوں کے پانی کا حوض چھ مہینے
ہوئے، پاٹ دیا تھا۔اب یہاں تانگے والے تو چھ آٹھ ہی رہ گئے۔ہم اس نوٹس کو لے کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس گئے تھے مگر انہوں
نے صاف دھو کر جواب دیا، کہا، مَیں کمیٹی کے کام میں دخل اندازی نہیں کرتا۔اب بندہ پوچھے اگر تُو دخل نہیں دے گا پھر تیری اماں دے

رے گی جس نے تجھے جَن کر ہماری قسمت میں لکھ دیا۔

پھر؟ میں نے پوچھا

پھر ہم اللہ کو سونپ کر آ گئے اور اللہ کو سونپے ہوئے کاموں کا جو حشر ہوتا ہے، اُس کا تمھیں پتا ہی ہے۔

تو اب کیا ہوگا؟ مَیں نے تاسف سے پوچھا۔

ہونا کیا ہے، میں نے تو سوچا ہے، اب میں دو مہینے کے بعد تانگہ شہر لانے کی بجائے ،،بتی موڑ،، پر ہی چلاؤں گا۔ وہاں ابھی تانگوں کا راج ہے۔

لیکن وہاں بھی تو دور کشے آ گئے ہیں، میں نے کہا

آ تو گئے ہیں لیکن دیکھی جائے گی، چاچے شاہ محمد نے گویا ایک حل نکال لیا تھا۔

اس کے بعد میں پھر لاہور آ گیا اور تین چار مہینوں کے بعد گاؤں جانے لگا۔ اس عرصے میں میری ہر دفعہ شاہ محمد سے ملاقات ہو جاتی۔ کیوں کہ اب وہ واقعی اپنا تانگہ شہر سے اُٹھا کر بتی موڑ کے اڈے پر لے آیا تھا۔ اس اڈے پر کمائی کم تھی لیکن شاہ محمد کو سواریاں بہر حال مل جاتیں اور دو سال تک حالات پُر سکون رہے۔ لیکن کب تک، آہستہ آہستہ یہاں بھی موٹر سائیکل رکشوں کا چلن عام ہو گیا اور شاہ محمد کا تانگہ بے کار رہنے لگا۔ میں جب بھی گاؤں جاتا اُسی کا تانگہ سام کرا لیتا لیکن میرے اکیلے سے اُس کی کیا کمائی ہوتی۔ دو سال اس طرح مزید چلے۔ پھر جو ایک دن میں ،،بتی موڑ،، پہنچا تو دیکھا، شاہ محمد بھی ایک رکشے پر بیٹھا سواریوں کا انتظار کر رہا تھا۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور ایک گونا سکون بھی ہوا کہ چلو اسے سواریاں تو مل ہی جایا کریں گی۔ سیدھا اُسی کے رکشے کی طرف بڑھا۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ سکوٹر رکشا پہلے ہی اسٹارٹ کر دیا۔ ایک دو رکشے والوں نے مجھے ہلکا سا ٹوکا بھی، بھائی جان ہمارے ساتھ آ جائیں، اِسے رکشہ چلانا نہیں آتا۔ لیکن میں اُن کو نظر انداز کر کے شاہ محمد کے رکشے پر بیٹھ گیا۔ شاہ محمد کا دل باتیں کرنے کو بہت کرتا تھا مگر رکشے کا شور اتنا تھا کہ ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے ہی سفر کرنا پڑا۔ اس سفر میں مَیں نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ رکشے والے ٹھیک ہی کہتے تھے۔ شاہ محمد کے ہاتھوں سے رکشہ ایک طرف کو نکل نکل جاتا اور کئی دفعہ سڑک سے گہری کھڈ میں گرتے گرتے بچا۔ میں پورے رستے دعائیں پڑھتا رہا اور دل میں آیندہ کے لیے اُس کے ساتھ بیٹھنے سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد میں نے سنا کہ اُس کا رکشہ دو مہینے کے دوران ہی پورا ہو گیا۔ اتنے ایکسیڈنٹ ہوئے کہ پہیے، گراریاں، چین، ہینڈل غرض ہر چیز کی ستیاناس پھر گئی۔ اس عرصے میں کئی سواریاں بھی پھڑکیں۔ جس کی وجہ سے انہوں نے جلد ہی شاہ محمد کے رکشے پر بیٹھنے سے اپنے اوپر حد لگا لی۔ ویسے بھی یہ سکوٹر رکشہ کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا اور نہ ہی اب اُس کی عمر سکوٹر رکشہ چلانے کی تھی۔ مَیں اگلی دفعہ گاؤں آیا تو شاہ محمد گاؤں میں داخل ہوتے ہی جو پہلا ہوٹل پڑتا ہے، وہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا مَیں کچھ دیر کے لیے اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ عمر تو کچھ ساٹھ سے تھوڑی اوپر تھی لیکن اتنا کمزور پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔ رنگ زرد اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا یہ وہی شاہ محمد ہے جو کچھ عرصہ پہلے ہٹا کٹا اور زندگی سے بھرپور

Scanned with CamScanner

تھا۔ایسی گری ہوئی صحت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور پوچھا، چاچا شاہ محمد اچانک آپ کی صحت کو کیا ہو گیا؟

شاہ محمد نے چائے کے کپ سے نظریں اُٹھائیں اور بولا، مجھے پتا تھا بھتیجے تُو یہی پوچھے گا۔ پر کچھ باتوں کا جواب نہ ہی دیا جائے تو یار بیلی سمجھ لیتے ہیں۔

پھر بھی کچھ تو پتا چلے، حالات کی ٹوہ لیتے ہوئے دوبارہ پوچھ لیا۔

بھتیجے چھوڑ ان باتوں کو ،، شاہ محمد ایک ٹھنڈی آہ لے کر بولا، ہمارے روگ تیری سمجھ میں نہیں آسکتے۔ یہ صحت تو اسی دن خراب ہو گئی تھی جس دن میں نے گھوڑا بیچ کے لوہے کا جہنمی پھٹ پھٹیا خریدا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی تانگے کا کوئی خریدنے والا نہیں تھا ورنہ اگر یہ نشانی بھی بک جاتی تو شاہ محمد اتنی دیر نہ چلتا۔ ابھی تک زندہ ہوں تو گھر کی دیوار سے لگے اُسی تانگے کو دیکھ دیکھ کر۔ خیر تُو اپنی سنا تیرا نوکری کا دھندا تو ٹھیک چل رہا ہے؟

جب رکشہ لے ہی لیا تھا تو بیچا کیوں؟ اچھی بھلی روزی روٹی چل رہی تھی۔

کہنے لگا، بیٹے کیا بولوں، تجھے تو پتا ہے ساری عمر ٹھاٹ سے رہے۔ تانگے پر بیٹھتا تھا تو اُس کا ساڑھے پانچ فٹ کا پہیہ زمین سے اتنا اونچا ہوتا کہ پیدل لوگ چھوٹے چھوٹے لگتے۔ تانگے کے بمبو پر بیٹھتے ہی قد بڑھ جاتا۔ تانگہ نوابوں کی سواری اور عزت کی نشانی ہے۔ لوگوں کے اصرار پر میں نے سکوٹر رکشہ خرید تو لیا لیکن جب اِس ڈیڑھ فٹ کے پہیے والی پھٹ پھٹی پر بیٹھتا تو ایسے لگتا زمین کے ساتھ گھسٹتا جا رہا ہوں۔ شرم کے مارے زمین میں ہی گڑ جاتا اور سوچتا، شاہ محمد ایسے رزق سے تو موت ہی اچھی ہے۔ آخر میں نے اُسے اونے پونے بیچ کر اس ذلت پر لعنت بھیجی۔

مجھے شاہ محمد کی بات پر ہنسی آئی لیکن ضبط سے کام لے کر اُس کو دبا گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اب اُس کی عمر رکشہ چلانے کی رہی نہیں تھی اور نہ عمر بھر اُس نے ان چیزوں کو چھوا تھا مگر شاہ محمد کا یہ عذر مجھے اچھا لگا۔ آہستہ سے کچھ پیسے نکال کر شاہ محمد کے نہ نہ کرتے اُس کی جیب میں ڈال دیے اور گھر چلا آیا۔ یہ میری اُس سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں کافی عرصہ کے لیے ملک ہی سے باہر چلا گیا اور جب آیا، وہ دنیا سے جا چکا تھا۔

گاؤں میں داخل ہونے کے بعد میرے قدم خود بخود اُس کے گھر کی طرف اُٹھ گئے اور جلد ہی وہاں جا کھڑا ہوا۔ آج اُسے فوت ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ میں اُس کے زمین بوس ہوئے کچے گھر کے سامنے سوکھے کیکر کے تنے سے لگے اُس تانگے کو دیکھ رہا ہوں۔ جس کے بمبو آدھے رہ گئے ہیں، پہیوں کو دیمک کھا چکی اور وہ ٹوٹ پھوٹ کر زمین میں دھنس چکے ہیں۔ سیٹیں اور لکڑی کی تختیاں کوئی نکال کے لے گیا تھا۔ وہ تانگہ اب ایک ایسا بدحال ڈھانچا تھا جس کا نہ کوچوان موجود تھا اور نہ اُسے کھینچنے والا گھوڑا۔ لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں، سکول سے نکل کر سیدھا اڈے کی طرف بھاگا اور شاہ محمد کے تانگے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شاہ محمد ایک نئی کہانی شروع کرنے والا تھا۔

Scanned with CamScanner

زاہد مسعود

”آبِ جو“

یہ کیسی آبجو
میرے حوالے کر رہے ہو
شجر
جس کے کنارے سرنگوں ہیں
اور ثمر تقسیم کرنے میں خیانت کر رہے ہیں
یہ کیسی آبجو ہے
جس کا پانی
اپنی فطرت کی روانی کھو رہا ہے
سو
اِس کے چھوٹے چھوٹے سے بھنور
جگنو پکڑ کر گھومتے ہیں
مری تاریک آنکھیں
خواب زاروں میں بھٹکتی ہیں
جہاں
حبسِ مسلسل کی تہوں میں کونپلوں کا خواب روشن ہے
ہوا
لہروں سے پتھر چن رہی ہے
جن کو
مٹی میں ملا کر ہم نے وہ دیوار کھینچی تھی
جسے
دیوارِ گریہ کی طرح سینہ بہ سینہ سینچتے ہیں
کنارِ آبجو ہم کب سے بیٹھے ہیں
ہماری جھولیاں
خوابوں سے، پتوں اور اشکوں سے تہی ہیں
سرِ شامِ الم
بے نور آنکھیں آسماں سے کہہ رہی ہیں
یہ آبجو
میرے حوالے کر رہے ہو!

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

حسن کاظمی

خوابِ سبز

قد آور درختوں کی شاخوں سے لپٹے ہوئے ناریل کے پیالے
کہ جیسے کئی لڑکیاں گاگریں سر پہ رکھے کھڑی ہوں
کسی لوک دھن پر پرندے
پروں کو پروں سے ملاتے ہوئے ناچتے ہوں
گھنے جنگلوں میں بہاروں کی پگڈنڈیاں بھاگتی ہوں
مگر اب وہ جنگل مگر اب وہ رستے
ہمارے لئے اجنبی ہو گئے ہیں

پہاڑوں کے دامن میں آباد تھے جو
اندھیروں کی چلتی ہوئی آندھیوں کو
اُجالے کی تلوار سے روکتے تھے
جو بانسوں کی سیتی کو تہذیب کہتے
جو گنگا جمنا سے مچھلی پکڑتے
جو پانی کے شہروں میں رہتے تھے اب وہ
ہمارے لئے اجنبی ہو گئے ہیں

وہ جادو جو بنگال کی روشنی ہے
وہ مٹی جو دہقان کی خامشی ہے
وہ خوشبو جو فنکار کی زندگی ہے
وہ کاغذ کا بازار، پٹ سن کی منڈی
وہ ڈھاکہ کی مکمل، وہ سلہٹ کی چائے
وہ گہرے سمندر وہ کچے گھروندے
ہمارے لئے اجنبی ہو گئے ہیں

یہ دستور ہے ایک مدت سے ساتھی
کہ مل کے بچھڑنا
بچھڑ کے بھی ملنا
مگر اب ہمارے ہی مانوس چہرے
ہمارے لئے اجنبی ہو گئے ہیں
ہم اُن کے لئے اجنبی ہو گئے ہیں
خود اپنے لئے اجنبی ہو گئے ہیں۔

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر اکرم عتیق

نوحہ گر

نوحہ گر اپنے کمرے کی دہلیز تک آ گیا
آ کے واپس ہوا
اس کے چہرے پہ تھی بے بسی خیمہ زن
بے یقینی کی زنجیر پاؤں میں تھی
نوحہ گر پر تذبذب کا آسیب تھا

پاؤں دہلیز تک آ کے رکتے رہے
نوحہ گر کے بدن میں تذبذب کی لہریں بکھرتی رہیں
وقت کٹتا رہا
وقت رکتا نہیں
وقت چلتا رہا

کشمکش کی کہانی نے انگڑائی لی
نوحہ گر کے قدم ہو گئے پار کمرے کی دہلیز سے،
یاس و امید سے جنگ کرتا ہوا
نوحہ گر ایک بازار میں آ گیا

نوحہ گر کی صدا میں بڑا کرب تھا
نوحہ گر کی صدا میں بڑا درد تھا
نوحہ گر بے حسی پر تھا نوحہ کناں
نوحہ گر کی صدا کوئی سنتا نہ تھا،
اپنے اپنے بکھیڑوں میں اُلجھے ہوئے
لوگ آتے رہے، لوگ جاتے رہے
لوگ مصروف تھے

ایک ہنگامہ تھا
ایک انبوہ تھا
کوئی تہذیب تھی اور نہ احساس تھا
نوحہ گر کی صدا بھیڑ میں کھو گئی
شور میں دب گئی

رات بڑھنے لگی!
نوحہ گر اُٹھ کے بازار سے
ایک خاموش کوچے کی آغوش میں آ گیا،
نوحہ گر کی صدا کھڑکیوں میں گھسی
کھڑکیاں بند ہونے لگیں
نوحہ گر بے حسی پر تھا نوحہ کناں
نوحہ گر کی صدا آنگنوں سے گزر کر
ہواؤں میں تحلیل ہوتی رہی

نوحہ گر کی صدا میں بڑا کرب تھا
نوحہ گر کی صدا میں بڑا درد تھا،
شہرِ بے گوش میں
ایک خاموش کوچے کی آغوش میں
نوحہ گر تھا اکیلا ہی بیٹھا ہوا

Scanned with CamScanner

اس کی آواز کوئی بھی سنتا نہ تھا
اس کی آواز میں کرب بڑھتا رہا
درد بڑھتا رہا

رات ڈھلنے لگی!
آپ ہی اپنے نوحوں کو سنتے ہوئے
نوحہ گر اُٹھ پڑا،
اپنے نوحوں کی دیوار سے لگ کے روتا رہا
نوحہ گر کی صدا سسکیوں کی ردا سے لپٹنے لگی
سسکیوں کی تھکن آنسوؤں کی قبا میں سمٹنے لگی

سسکیوں کی ردا سے لپٹتے ہوئے
آنسوؤں کی قبا میں سمٹتے ہوئے
نوحہ گر اپنے گھر کی طرف چل دیا،
گھر میں داخل ہوا

گھر کے افراد نے
ناگواری کی آنکھیں گھماتے ہوئے
خشمگیں چتونوں، شعلہ باری کی نظروں سے دیکھا اسے،
اس کو پاگل کہا

نوحہ گر نے سنا
نوحہ گر چُپ رہا
نوحہ گر نے کسی سے نہ کچھ بھی کہا
نوحہ گر چُپ رہا

☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

شازیہ محمود

نظم

لمحے ٹوٹی ہوئی گھڑی کی سوئیوں کی طرح
رک کیوں جاتے ہیں
عمر گزر جاتی ہے
آنکھ سے سپنے بنتے
پلکوں سے ریزے چنتے
نصاب کے اسباق
بچوں کے ذہنوں میں منتقل کرتے
املا درست کرتے
اپنے آپ کو بھول گئی ہوں
خود کو کھوجتے کھوجتے
تھکن سے چور بدن
مجھے کسی اور سمت گھسیٹ رہا ہے
نہیں جانا مجھے وہاں
جہاں وہ نہیں ہے

☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

ابوالحسن یمین الدین

راشد جاوید احمد

حضرت امیر خسرو دہلوی (1253-1325ء) برصغیر کے وہ اوّلین سخن گو ہیں جن کے کلام میں اس علاقے کی گونا گوں تہذیب اپنے رنگوں کی نقاشی کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔ حضرت خسرو نے اگرچہ اپنی شاعری کا بیشتر حصہ فارسی میں قلم بند کیا ہے، لیکن ان کی اُردو یا ہندوی شاعری اس لحاظ سے ایک بے مثال مرتبہ رکھتی ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو نہایت فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اُردو ادب میں اس میدان میں خسرو کا موازنہ صرف نظیر اکبر آبادی (1740-1830ء) کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جس نے خسرو کے پانچ سو سال بعد اپنا ایک منفرد لوک لہجہ اختیار کر کے شاعری کی ایک اور طرح ڈالی۔

اُردو زبان کی اولین نگارشات دکھنی بولی میں ملتی ہیں۔ صوفی شاعروں نے پہلے پہل اسی بولی کو بڑھاوا دیا۔ اس طرح سے ایک ممتاز صوفی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو دکھنی اُردو کا اولین تخلیق کار مانا جاتا ہے۔

خشونت سنگھ کا کہنا ہے کہ امیر خسرو کی طرح میر تقی میر، اقبال اور غالب نے بھی پہلے پہل فارسی میں شاعری کی لیکن عوام کے دلوں میں اترنے کے لیے جو زبان ان کے کلام کی ترسیل وتشہیر کے لیے موزوں ترین تھی وہ تھی اُردو۔ ایک شاعر یا ادیب بہر حال اپنی زبان میں اظہارِ خیال کر سکتا ہے جس میں وہ اپنا تجربہ حسن وخوبی کے ساتھ بیان کر کے دوسروں تک اسی طرح پہنچائے کہ وہ اس تجربے کے اظہار کو اپنے ہی دل کی بات تصور کریں۔ علامہ اقبال سے جب کسی نے سوال کیا کہ آپ فارسی میں بھی شاعری کرتے ہیں تو انہوں نے کہا اگر میرے بس میں ہوتا تو میں عربی میں شاعری کرتا کیونکہ عرب قوم کو وقت کے تقاضوں کے مطابق خوابِ غفلت سے جگانا ہے۔

اقبال کے اردو کلام کے مقابلے میں ان کا فارسی کلام بدرجہا بہتر مانا جاتا ہے۔ غالب کی قسمت میں اردو ہی کے ذریعہ مقبول مشہور ہونا تھا اور وہ اُردو دنیا میں اپنی پذیرائی کے اس والہانہ پن کو روک نہ سکے۔ اسی طرح امیر خسرو بھی خالصتاً فارسی سخن گو تھے۔ اگرچہ انہوں نے دوہے، پہیلیاں اور برج بھاشا میں اپنے کلام کا ایک حصہ بھی تخلیق کیا ہے۔

خسرو نے اپنے کلام کو فارسی اور اُردو برج کھڑی بولی کے امتزاج سے ایک منفرد تزئین اور نقاشی سے سنوارا ہے۔

امیر خسرو نے ننانوے تصانیف تخلیق کیں اور ان کا بیشتر کلام زبانِ شیراز ہی میں موزوں ہوا لیکن خسرو اپنی فارسی سخن گوئی میں بھی مادرِ وطن کے ایک حساس فرزند کی حیثیت میں نغمہ سرا ہیں۔ عظمتِ وطن، اس کے عوام، بدلتے ہوئے جغرافیائی مناظر، مہکتے ہوئے گل گلزار، تناور درخت اور رواں دواں ندیاں اور دریا ان کے محبوب موضوعات میں شامل ہیں۔

چو من طوطی ہندم اررا ست پرسی

زمن ہندوی پرس تا راست گویم

فارسی اور ہندوی کی ممزوج غزل کا یہ بے مثال نمونہ امیر خسرو ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے:

زحال مسکین مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چو زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشمِ جادو بصد خرابیم صبر و تسکین

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بہ عشق آں مہ

نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روزِ وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت من کو درائے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کی گھتیاں

کیا امیر خسرو نے ہندوی زبان میں شاعری کی ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر انیسویں صدی میں یہ مباحثہ چھڑ گیا کہ حضرت سے منسوب ہندوی شاعری دراصل ان کے زورِ قلم کا نتیجہ نہیں ہے لیکن بعد میں بہر حال اس امر پر اتفاق رائے پایا گیا کہ چونکہ اس نوع کا کلام امیر خسرو کے سوا اور کسی شاعر کے ساتھ تاریخی اعتبار سے منسوب نہیں کیا جا سکا لہٰذا اسے امیر خسرو ہی کا کلام تسلیم کیا گیا، لیکن افسوس کا مقام

Scanned with CamScanner

یہ ہے کہ ان کا ہندوی کلام زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا اور جو کچھ ہم تک آج ان کے ہندوی کلام کی شکل میں پہنچا ہے وہ سینہ در سینہ ہی محفوظ رہ سکا ہے اور اس کے ایک فرد سے دوسرے فرد تک منتقل ہونے کے عمل میں تغیر و تبدیلی کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

خسرو خود ہندی زبان پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ترک ہندوستانیم در ہندوی گویم جواب

شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

خسرو نے اپنے ہندی یا ہندوی کلام کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس میں انہوں نے نزاکت اور معنی آفرینی کے جو گل و گلزار کھلائے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ مثلاً:

رفتم بہ تماشائے کنارے جوئے

دیدم برلب آب زنِ ہندوئے

گفتم صنما بہائے زلف چہ بود

فریاد برآورد کہ ڈرڈر موئے

(میں نے ایک جوئبار کے کنارے ایک ہندوستانی دوشیزہ کو دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تمہاری ان زلفوں کی قیمت کیا ہے۔ اس نے جواب دیا ڈرڈر موئے۔ ادموئے دور ہو جا دور ہو جا۔ انہی الفاظ کے دوسرے معنی یوں ہیں۔ ڈرڈر موئے یعنی میری ایک ایک زلف کی قیمت ایک ایک موتی ہے۔)

وطن کی ہر شے اور بالخصوص حسن کے تئیں امیر خسرو کی والہانہ محبت کا جو عالم تھا اسکے مقابلے۔ ان کو چین کا حسن بھی نہیں جچا کیونکہ ان کے معیار کے مطابق اس میں عجز و انکسار نہیں۔ تاتاری حسینوں کے لبوں پر ہنسی نہیں دکھائی دیتی اور ختن کے حسینوں کے چہرے پر نمک نہیں ہوتا۔ سمرقند اور قندھار کے حسن میں مٹھاس یعنی قند کی کمی ہے۔ اسی طرح مصر اور روم کے سیمیں بدن حسینوں میں وہ چستی اور چالاکی نہیں پاتے۔ خسرو کو ہندوستان کے حسن میں یہ ساری خوبیاں دکھائی دیتی ہیں یعنی عجز و انکسار بھی، لبوں پر تبسم بھی، چہرے پر نمک بھی، شیرینی بھی، اداؤں میں چستی اور چالاکی بھی۔ اسی لیے بے اختیار ہو کر کہتے ہیں:

بتانِ ہندرا نسبت ہمیں است

بہر یک موئے شاں صد ملکِ چین است

امیر خسرو نے شاعری کسی تفریح یا تفنن کے لیے نہیں کی بلکہ ان کی اس شعوری کوشش اور تجربے کا ماحصل اس ایک نئی زبان کی ابتداء میں دیکھا جا سکتا ہے، جسے ابوالفضل نے دہلوی کا نام دیا اور پھر جسے لوگوں نے ریختہ کی حیثیت میں پہچانا اور جو بالآخر اردو کی شکل

Scanned with CamScanner

میں تختِ کی سرکاری زبان بن گئی۔

دہلی سے انہیں اتنا لگاؤ تھا کہ ایک بار جب وہ کچھ عرصہ تک دہلی سے باہر رہنے کے بعد واپس اس شہر میں آئے تو انہوں نے کہا کہ دہلی آ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا حضرت یوسف چاہِ زندان سے باہر نکل آیا ہو۔ اپنی مثنوی ''قرآن السعدین'' میں امیر خسرو نے دل کھول کر دہلی کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ اس مثنوی کو ''در صفتِ دہلی'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

امیر خسرو نہ صرف ایک عہد ساز شاعر تھے بلکہ وہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے بھی موجد تھے۔ انہوں نے ہندوستانی موسیقی کے مختلف مقامات کو مرتب کر کے جو راگ ایجاد کیے ان میں مجیر، سازگری، ایمن، مشتاق، موافق غنم اور زیلف وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مقامات ہندی میں پہلے ہی موجود تھے۔ امیر خسرو نے ان میں کچھ تبدیلیاں کر کے ان کے نام بدل ڈالے۔

گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں ہندوستان کے عاشق صادق اور سچے وطن پرست تھے۔ اپنی شاعری میں جہاں جہاں وہ امیر خسرو ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں ان کی روح وجد میں آجاتی ہے اور جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔

ہندوستان کے موسموں، تیوہاروں اور رسومات کے بارے میں خسرو نے فارسی اور ہندوی میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے لاتعداد اشعار پر مشتمل ہے

۔برسات کے موسم کی یہ تصویر کشی ملاحظہ ہو:

ہوائے خرم است و ہر طرف باراں ہمی بارد
نگویم قطرہ کز بالا گل ریحاں ہمی بارد
نگوں سر شاخ ہائے سبز گوئی ور ہے جنبد
زبس کابر در افشاں لولوئے غلطاں ہمی بارد

ہولی ہندوستان کا ایک روایتی اور رنگین تیوہار ہے اور اس کے تئیں خسرو نے اپنے ذوق وشوق کا مختصراً یوں اظہار کیا ہے:

دَیاری موہے بھجویارے/شاہ نجام کے رنگ میں
کپڑے رنگنے سے کچھ ناہوت/یار نگ میں میں نے تن کو ڈبویارے
واہی کے رنگ سے سن وے شوخ رنگ/خوب ہی کل کل دھویارے
پیر نجام کے رنگ میں بھجویارے

ساون یعنی برسات کی رُت بھی ہندوستانی موسموں میں سب سے شاعرانہ اور جذبات خیز موسم ہے۔ امیر خسرو نے اس رنگین موسم کی کہانی ہلکے پھلکے انداز بیان میں لوک رنگ میں اس طرح بیان کی ہے:

Scanned with CamScanner

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا/ بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا/ بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی کہ ساون آیا/ بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا ہے:

اور اسی طرح مکئی کے بھٹے کی یہ تصویر کشی امیر خسرو کی فارسی میں ملاحظہ ہو:

پیر مردہ لطیف ریش سفید/ کردہ دندان سرخ چوں گلنار
ہفت کرتہ بدارد او بر تن/ تا یکے کرتہ ے رود در نار

امیر خسرو نے اپنی 72 سالہ زندگی میں کئی انقلابات دیکھے جو سلطنتوں اور حکومتوں کے عروج و زوال کا باعث بنے۔ واقعاتِ زمانہ سے بے نیاز حضرت خسرو نے صرف اپنی صوفیانہ اور ادبی زندگی ہی کو اپنے ذوق و شوق کا مرکز بنا لیا۔ ان کا تصوف کے فکر و فن کے اظہار کا ایک بہت بڑا منبع ہے۔ خسرو کی شاعرانہ صلاحیتوں کا نکھار اور جلال ان کی اسی شاعری میں ابھر کر سامنے آتا ہے جس میں انہوں نے اپنے ملک ہندوستان اور ہندوستانیت کے گیت گائے ہیں۔ خسرو کا اسلوب اس حوالے سے ان کے بعد آنے والے ہندوستانی شاعروں سے نہایت الگ تھلگ اور ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

اپنے محبوب شہر دہلی میں قیام پذیر ہوتے ہوئے بھی امیر خسرو نے سارے ملک کے اُن ثقافتی پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی ہے جن کا ذاتی اور عملی تجربہ کیے بغیر ان کی صحیح تصویر کشی کرنا بصورت دیگر ناممکن نظر آتا ہے۔ یہی خسرو کے فن اور نکتہ بین نگاہ کی جولانیوں کا کمال ہے۔

امیر خسرو قدیم و جدید ہندوستان کی ادبی زندگی میں ایک مقبول نام ہے جسے یہ خطہ ارضی ابوالحسن یمین الدین کے اصلی نام کی بجائے امیر خسروی کے نام سے جانتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے اعلیٰ پایہ کے سخن گو، موسیقار، موجد، فلسفہ دان، ماہر لسانیات اور عظیم درجہ کے صوفی تھے۔ حضرت امیر خسرو کی شاعری اور فن کے حوالے سے ہندوستانیت کی عکاسی کے متعلق علامہ اقبال نے ان کے بارے میں بجا طور پر کہا ہے

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمہ خسرو

☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

ملکہ غزل فریدہ خانم

(فلمی نغمات کے آئنے میں)

پروفیسر سلیم الرحمٰن

''اے میں کیا جی آنا ذرا جلدی آنا فریدہ خانم آئی جے۔'' گلابی رُت کی گلابی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ ہمسایوں کے گھر سے خاتونِ خانہ کی آواز آئی جو اپنے شریکِ حیات کو ذرا EXCITMENT سے بتا رہی تھیں آواز دیکر بُلانے کے اسلوب میں ایک پرکشش سے نیم رومانوی سے اذدواجی ہم آہنگی کھنک رہی تھی پھر عجیب سے فضا تھی کہ جیسے دو عشاق میں سے کسی ایک عاشق نام دار نے اپنے محبوب کو معشوق کو پہلے دیکھ لیا ہو اور اب وہ اپنے اُس محبوب کو دیکھنے کے لیے دوسرے مُحب کو دعوتِ دیدار دے رہا ہو۔

فریدہ خانم۔ جی ہاں سراپا غزل۔ غزل سراتھیں اور اُس گھڑی وہ سکرین پر اپنے پختہ۔ ریاضتی خوبصورت سُریلے VOCAL CRD کا حُسن بکھیرنے کے ساتھ ساتھ اپنے جمال سراپا کی جلوہ نمائی بھی کر رہی تھیں۔ انکے ٹی وی پر نمودار ہوتے ہی اُن خاتون نے غالباً دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنے شوہر مہربان کو بلایا تھا اور وہ دونوں ہمسفر بھی فریدہ جی کے لاکھوں مداحین میں سے تھے اور یہ راقم خاکسار تو اس بھیڑ میں یقیناً موجود ہی رہتا ہے۔

چند لمحوں کے بعد اُس گھر سے ٹی وی کا والیم ذرا سا بلند اور واضح ہو گیا اور کانوں میں غزل کی مُدھ گائیکی کی بے تاج ملکہ کی موثر۔ سُریلی اور دلنشین آواز آئی۔

اک آگ غم تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہوں تو دامنِ دل کو بچائیں کیا

میں ہم تن گوش ہو گیا۔ جی چاہا کہ ٹی وی آن کروں اور اپنی محبوب صاحبِ اسلوب مغنیہ کے نیاز حاصل کروں کہ دیکھنے اور سننے میں وہ سراپا جمال ہیں۔ ریڈیو لاہور میں بارہا اُنکے نیاز حاصل ہوئے اُنہیں دیکھنے کا آداب کرنے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ فن مصوری کا

Scanned with CamScanner

عملی نمونہ دیکھا اور دیکھتے ہی چلے جانے کو جی چاہتا رہا۔ جب وہ آئیں تو اُنکے آنے سے پہلے عطر و عنبر کے جھونکے آنے لگتے۔ مانی کی بوقلمونی اپنے جلوے دکھانے لگتی اور پھر یوں بھی لگتا کہ تاج محل چلا آرہا ہے۔ خوش وضعگی خوش لباسی ایسی کہ بس دیدنی۔ معطر معطر خراماں خراماں۔ ساڑھی کا خوشرنگ پلو اُن سے نہیں سنبھل رہا ہے اور ساڑھی کے پلو سے خود خوشرنگ فریدہ نہیں سنبھل رہی۔

جمال دیدنی۔ کمال شنیدنی۔

گویا بقول منیر نیازی

ع ہر رہگذر پہ طبلۂ عطار کھل گیا

جہاں جہاں سے گزرتیں طبلۂ عطار کھلتا چلا جاتا۔

اُنکا رعجز اخلاص اخلاق اس پر مستزاد، بقول حضرت حمید صابری ''۔۔۔۔سلیم بھائی ایسا اخلاق، ملنساری۔ سبحان اللہ نہ کسی مغنیہ میں دیکھا نہ سنا۔ پیارے ملنے کا ایسا حسن ایسا جمال کہ آپ اپنی مثال۔ پہلی بار ہی ملیں تو گویا برسوں کی شناسائی۔ اتنی شیریں اتنی مٹھاس اتنی شفقت اتنا پیار کہ خاص انہی کا حصہ ہے'' جتنا عرصہ ریڈیو اسٹیشن میں قیام کرتیں یوں سمجھتے کہ ایک سمپون راگ مع اپنے لوازم ترفی لوازمات ریڈیو کے اسٹوڈیوز کی در و دیوار میں اپنی آنس کی مہک بکھر رہا ہے۔ اردیں میں جمال امروہی میں کمال۔ مرزہوے اچھوب تال تک یکساں مہارت کے ساتھ غزل رانی کی حکمرانی۔

اوراقِ مصور کا حُسن انگیز ورق۔ ملکۂ غزل۔۔۔سراپا غزل۔۔۔۔

ع اُنکی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

فریدہ جی کے فن کے ساتھ ساتھ اُنکی ظاہری آن بان ٹھاٹھ باٹھ شان و شوکت اور سج دھج چھب کا ذکر چھڑ گیا ہے۔ ایک ہلکی سی صدائے ساز آنے لگی ہے۔ و چترونیا میں پر کوئی راگنی سی چھڑنے لگی ہے۔ جیسے کہیں دور مخمور کر دینے والا ستار بج رہا ہوں اور جمالیاتی دداشت پر پڑے جھالے کو اتارنے لگا ہو۔ بیک وقت نخلِ جان کی ٹہنیوں پر متین گل کھِل اُٹھے ہیں۔ دو کی خوشبو بڑی ہی مسحور کن ہے اور ایک گل یار کی خوشبو بڑی ہی اداس۔ افسردہ ملول سی کافوری مہکا میں ملفوف ہے مگر خوشبو جیسی بھی بھلا کبھی ملفوف بھی رہ سکی ہے۔۔۔۔؟ نہیں۔۔۔نہیں کبھی نہیں۔۔۔۔!۔ سرِ دست اول الذکر دو پھولوں کی مہکار سے مشام جان معطر کیجئے۔

''۔۔۔۔جب فریدہ خانم نے سکرین پر جلوہ افروز ہونا تو اماں نے سکرین پر نظر پڑتے ہی کہنا'' واہ۔ واہ کیا خوبصورت لڑکی ہے۔ واہ دیکھو تو کیا حسین۔ واہ ارے دیکھو تو بڑی حسین لڑکی ہے یہ۔''

اور پھر ہم نے فریدہ خانم کو سننے کے ساتھ ساتھ دیکھتے ہی رہنا دیکھتے ہی رہنا۔۔۔'

یہ محترم شعیب ہاشمی صاحب تھے (ہمارے محبوب شاعر فیض کے فرزندِ نسبتی) جو ٹیلی ویژن پر نشر ہونیوالے پروگرام ''خزانہ

تھیں'' میں اظہار خیال کر رہے تھے اور یہ خراج پیش کیا جا رہا تھا عہد ماضی کی مشہور و معروف صاحب ادا صاحبِ اسلوب مغنیہ مختار بیگم (امرتسر والی) کی چھوٹی ہمشیرہ عہد رواں کی نامور ترین مغنیہ فریدہ خانم کو کیمرہ مین نے کیمرہ کلوز کیا (جب شعیب ہاشمی صاحب اظہارِ خیال کر رہے تھے اُس دوران) تو ملکۂ غزل سراپا غزل بنتی جا رہی تھیں۔

گلشن تذکرہ فریدہ میں یہ دوسرے گل یاد کی مہلک ہے یہ مہکار بھی بالیقین آپ تک پہنچا ہی چاہتی ہے۔

''فریدہ خانم ہائے وہی نظراں وچ کُھبدے نیں جدوں دوھ کے ساڈ تے دھرا اندر تائیں ریت نال جڑے ہوئے ٹشن (گلیمر) تے اُتوں کسب کُن۔ اوراگ رنگ دیاں شاماں دی جند جان ہوندے نیں میڈیا اُنہاں نال پہلے دن توای نہال اے گُنی گائیک ہوندیاں اوہناں دی گھن چھانویں کیلواں رکھ رکھاؤ تے نرم ملائم ورتارا اہناں دسباں اونہاں نوں ہوروی سُہل کیتا اے انج ای اوہنا دیاں دوسریاں لئی چاہ اے۔ جیڑا اک واری نیڑے آ گیا اونہاں دا ای ہو رہیا۔۔۔۔۔۔۔فریدہ خانم دی جوانی۔ سوہنپ تے گانا اوتوں اُونہاں دے ہمرویلے بھیویں کپڑے۔ اکھاں ٹنڈیاں رسیدیاں نیں دیکھن والیاں دیاں۔۔۔''

یہ مہک بکھیر رہے تھے محترم و مکرم مقصود ثاقب موضوع ''فریدہ خانم'' اور یہ مضمون نما انٹرویو اُنکی خوبصورت تصنیف ''سنگیت کاراں دیاں گلاں'' میں شامل ہے اور اُنکی اس تصنیف میں (مذکورہ مضمون) ایک متصل حسین اور پر جمال اضافہ ہے جیسا کہ ملکۂ غزل غزل کی شدھ گائیکی میں اپنے جمال و کمال سے مستقل اضافہ کرتی رہتی ہیں۔

ان دو مذکورہ معطر تذکروں پر ایک عجیب سی سوگواری مہک ایک کرب سمیت ایک پرگداز جھونکا بن کر آنے لگی ہے۔

اپنے دور کے نامور ریڈیو پروڈیوسر۔ اجل موسیقی دان۔ شاعر۔ ادیب جناب شادؔ امرتسری (محمد شریف شادؔ) دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تو اُنکے حلقہ احباب کو ایک دھچکا سا پہنچا تھا۔

وہی شاد جسنے کبھی کہا تھا

شاد امرتسری کو دیکھیئے گا
اک نہ اک دن شہید ے ہو گا

اور پھر یہ کہ

آنسو رکے تو آہ اُٹھی بے کلی کے ساتھ
ہر حال میں نباہ کیا زندگی کے ساتھ

آخر زندگی سے لشتم پشتم نبھاہ کرتے ہوئے ایک روز انہیں نباہ ہی دیا شنید ہے کہ ''عجب آزاد مرد تھا'' (خدا مغفرت کرے) لاہور کے ایک قبرستان کی جنازگاہ میں شاد امرتسری کا جنازہ پڑا ہے۔ فضا سوگوار ہے اس سوگوار فضا میں پھیلی ہوئی کافوری مہک

Scanned with CamScanner

ہولے ہولے چلنے والے جھونکوں کے دوش پر ادھر ادھر اڑ رہی ہے۔

یہ سوگوار فضا۔ ایک سریلے سُر شناس کن رسیے کی سدا کی لیے مُندی ہوئیں آنکھیں۔ اسمیں سوگوار فریدہ خانم بھی موجود تیں۔

آیئے آپکو یہ منظر محترم و مکرم سید محمد اسلام شاہ صاحب کی تصنیف کی وساطت (طائرانہ نظر۔۔۔ مضمون۔۔۔۔ شادا مرتری) سے دکھا تا ہوں''۔۔۔۔ فنکاروں میں اُستاد بڑے غلام علی خان۔ اُستاد نتھو خان (سارنگی نواز) اُستاد شوکت حسین (طبلہ نواز) مہدی حسن۔ روشن آرا بیگم اور فریدہ خانم کے فن کو بہت پسند کرتا تھا۔

یہ لوگ بھی اسکی بہت قدر کرتے تھے۔ فریدہ خانم تو آخری بار اسکا منہ دیکھنے کے لیے جنازگاہ میں پہنچ گئی۔ ساڑھی کے دونوں پلو دانتوں میں دبائے۔ ننگے پاؤں۔ ہاتھوں میں پھول اور سوجھی ہوئی آنکھوں میں نرمل نیر لئے ایک بجارن کی طرح وہ اس سنگیت کے رسیا کے دوار حاضر تھی۔ اُسے دیکھ کو یوں محسوس ہوا جیسے شاد کے دوست موجد نے ''داغ فراق'' کے سرورق کے لیے ایک تصویر موزوں کردی ہے۔

فریدہ جی کے فن و شخصیت کے تذکرے کے آغاز میں کہیں مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے انہیں ''اوراقِ مصور'' کا ایک ورق کہا کہا تھا۔ جناب شاہ جی محترم کا یہ خوبصورت مضمون پڑھا فریدہ جی کو اس ملول اور افسردہ فضا میں سوگوار سوگوار سے دیکھا۔ کانوں میں تصوراتی طور پر کہیں دور سے آواز آنے لگی ہے۔ بڑی ہی موثر بڑی ہی دلپذیر۔ آپ بھی سنئے گا۔ گائیکہ اسلوب سب نے جدا کائیکی کا انداز اور نرالا اور جسکی غزل پیش کررہی ہیں اُسکا انداز بیاں اور''

ہم پر جفا ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نقصاں نہیں جنون میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

ریڈیو لاہور سے کئی بار مجھے اس غزل کی اناؤنسمنٹ کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا رہا اسکی طرز باکمال میوزک ڈائریکٹر ماسٹر منظور نے بنائی تھی۔ لاجواب طرز باکمال گائیکی ملکۂ غزل کی گائیکی پر بلاشبہ ایک مفصل مضمون قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ ان شاءاللہ یہ قرض

بکاؤں گا۔

ایک محتاط ترین تحقیق اور چھان پھٹک کے مطابق فریدہ خانم جی کے فلمی نغمات کی گائیکی کا آغاز 1961ء سے ہوتا ہے۔اور انکے لیے فلمی نغمات کی طرز بنانے کا سہرا میوزک ڈائریکٹر اعظم بیگ کے سر بندھتا ہے۔فلمز حیات کے زیر اہتمام فلم ساز وزیر علی نے ہدایت کار ایم جے رانا سے فلم شیر اسلام بنوائی۔لیلیٰ۔رتن کمار اور رخسانہ اس فلم کے نمایاں اداکارہ تھے۔27 اکتوبر 1961ء کو یہ فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی باکس آفس پر ناکام رہی۔زیر موضوع مغنیہ کے تذکرے میں Chronological حوالے سے اس کا ذکر ازبس ضروری ہے کہ فلمی نغمات کے آئینے میں اولین مرتبہ اس فلم کے حوالے سے فریدہ خانم کا نام نامی پردہ سکرین پر بطور پلے بیک سنگر جلوہ افروزہ ہوا تھا فلم کے نغمات کو بھی فلم کی طرح سے کوئی پذیرائی نہ مل سکی۔نغمہ نگار قتیل شفائی نے اس فلم کے لیے عدد نغمات لکھے تھے۔تین نغمات فریدہ خانم کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے۔

گراموفون ریکارڈز کلکٹرز کے زاویہ نظر سے ان نغمات کا شمار نہایت نایاب نغمات میں ہوتا ہے۔اسکے 78R:MP کے ریکارڈ بنے یا نہ بنے واللہ اعلم بالصواب!

ممکن ہے کچھ شائقین کو یہ نایاب نغمات سننے کا شرف حاصل ہوا ہو یا کچھ کے پاس یہ نغمات موجود ہوں۔مختصر یہ ہے راقم خاکسار کو تادم تحریر ان نایاب نغمات کی سماعت کی تشنگی ہنوز ہے آئندہ شاید یہ پیاس بجھ پائے یا نہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔جدول میں آپکے ملاحظہ کے لیے انکا اندراج پیش کر دیا ہے۔

فریدہ جی کے تذکرہ جمال کا کارواں رواں دواں ہے۔اس کارواں سے اُٹھنے اور آنے والی جرس کی ندا نجانے کیوں اپنا رخ اُنکے تذکرہ کمال کی طرف موڑنے لگی ہے۔

1965ء کی جنگ چھڑنے میں ابھی ایک سال سے زیادہ کا عرصہ پڑا ہے۔نسبت روڈ اپنے ننھیال کے ایک کمرے میں پڑے PYE کے خوشرنگ (ٹیوبوں والا جو بجلی سے چلتا تھا) ریڈیو سے دوپہر کے وقت ایک عجیب سا نغمہ بڑا ہی منفرد سا فضا میں بکھر رہا ہے۔

ع سجن لاگی توری لگن من ما

توجہ فوراً اپنی طرف مبذول کروا لینے والا نغمہ دو آوازوں میں (الگ الگ) دلکش اور دھیما دھیما سا سرگم نغمہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا دادرے کی مہکار پھیلتی جاتی تقاضائے سن نے تب اس نغمہ کی فنی خوبیوں کا نوٹس نہیں لینے دیا تھا مگر ایک مخصوص کشش۔رغبت اور کھینچاؤ ضرور محسوس ہوا تھا تب بھی۔وقت گزرنے کے ساتھ اس نغمے کی پرتیں بنتیں اور کھلتی چلی گئیں۔پہلے سماعت میں کن رسی کا بکسہ میں اس کی پرت سازی ہوتی پھر پرت کشائی۔لمبے لمبے وقتوں کے بعد جب بھی نغمہ کانوں تک پہنچا ایک منفرد سا احساس مسرت ہونے لگتا۔خوب یاد

پڑتا ہے کہ نیم کلاسیکی اگھتا میں رچا بسا یہ نغمہ ریڈیو لاہور سے فلم ''باجی'' کے لیے اس درویش منش موسیقار سلیم اقبال نے بیدی ش
سے پٹیالہ گھرانے کی دو منجھی ہوئی پختہ کار فضاؤں سے ایسا گوایا ہے کہ بس سبحان اللہ! سبحان اللہ۔

مذکورہ فلم میں ایک اور نغمہ ہنر مند اور گنی گائیکہ نسیم بیگم کی آواز میں بھی تھا۔ یاد کیجئے۔

ع چندا توری چاندنی میں جیا جلے جائے رے

اس نغمے نے برس ہا برس قبل مقبولیت کے جھنڈے گاڑے رکھے تھے۔ بڑی دھومیں تھیں اسکی۔ مگر جب ذرائع ابلاغ
(بالخصوص ریڈیو) پر ''سائے کی طرح عجب وقت پڑا تھا'' تو اس خوبصورت اور سُریلے نغمے کو Ban کر دینے کے لیے بیسیوں خط
آرڈر آتے تھے۔ اسلیے کہ اس میں ایک جگہ یہ مصرع آتا تھا

ع آنے والا رام جانے آئے کہ نہ آئے رے

''رام'' نے بڑے ہی اعصاب شکن عرصے تک اس سُریلے نغمے کا گلا گھونٹے رکھا۔

اس نغمے کی اجمالی کہانی (نسیم بیگم اور سلیم اقبال کے فن کے حوالے سے) آپکو نسیم بیگم دختر بی بی بدحاں امرتسر والی کے تذکرے
میں ان شاءاللہ سناؤں گا۔ (اگر اللہ کو منظور ہوا تو)

خیر آمدم برسرِ مطلب! بڑی مصدقہ بات ہے کہ ملکہ غزل فریدہ خانم ملکہ ترنم نور جہاں جی کے ساتھ ہم نوائی کرنے کے بوجود
رضامند نہیں ہو رہی تھیں۔ سلیم اقبال (میری اس درویش صفت موسیقار سے بڑی نیاز مندی تھی کمال کے انسان تھے خوش قسمتی سے بہتر
برس پیشتر ستمبر 1984ء میں انہوں مرے ایک شوخ و شنگ سے نغمے کی طرز بھی بنائی تھی کورس نما نغمے میں نمایاں آواز افشاں کی تھی۔

پہلے مکھڑا دیکھئے پھر آگے چلیں گے

ہریالی آئی ہریالی کھیتوں پر ہریالی
پون چلے کچھ ایسے جیسے گوری جھانجھر والی

یہ ریڈیو لاہور کے سی پی یو میں ایکارڈ ہوا تھا)

اور آپ آتے ہیں دو گوریوں کے تذکرے کی طرف یعنی فریدہ جی اور نور جہاں جی فلم میں یہ نغمہ اپنے عہد کی دو نامور رقاصاؤں پر فلمایا گیا ہے یعنی ایمی مینوالا اور پنا۔ اس محفل رقص و سرور میں فلم انڈسٹری کے نامور ترین اداکار اور اداکارائیں بیٹھی ہیں اور بڑی ہی محویت سے قوس قزح میں ڈوبے ہوئے رقص و سرور کو دیکھنے میں محو ہیں۔

مسحور کن رقص۔ مسحور کن طرز مسحور کن گائیکی گویا فلمی نغمات کی موسیقی میں ترفع یعنی PUBLIMITY کی ایک خوبصورت
مثال۔ سلیم اقبال نے ملکہ ترنم نور جہاں اور ملکۂ غزل فریدہ خانم کو کمال ہنر مندی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ دونوں کی خوبصورت چھوٹی چھوٹی

Scanned with CamScanner

پیش، بہلادیں، سرگم۔ پلٹے۔ پہلے بلمپت۔ درت اور بین الغنا بڑی ہی دلکش آنکھ مچولیاں دیکھنے سننے کو ملتی ہیں۔ دونوں مغنیاؤں نے سلیم اقبال کی چھایا میں نغمہ نگار احمد راہی کے اس منفرد نغمے کو بلاشبہ چہار چند کر دیا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں نور جہاں نے اس نغمے کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا تھا ''سبحان اللہ! میری خوش نصیبی تھی کہ مختار بی بی کی چھوٹی بہن کے ساتھ گا رہی ہوں''

اور ملکۂ غزل نے اپنے اس انٹرویو میں اس گُلِ نغمہ کو یوں گُلِ تازہ میں متبدل کیا تھا۔

''فلم باجی میں مجھے نور جہاں جی کے ساتھ گانے کا موقع ملا اور یہ سمجھئے کہ مرے لیے یہ ایک اعزاز تھا۔''

اس نغمے کے بارے میں دونوں گائیکاؤں کی رقابت کے حوالے سے عجیب وغریب من گھڑت قصے کچھ عرصے کے لیے سامنے آتے رہے۔ ''سنیہ گزٹ سازوں'' نے بہت کچھ اول فول کہا۔ مگر۔ مگر یہ کہ سب عبث۔!

سچ ہے کہ من گھڑت کہانی صدق وسچائی کے من سے ہمیشہ مغلوب عہا کرتی ہے۔ بہر حال نغمہ کبھی دوبارہ سنیئے گا اور راگ مالگنجی میں سلیم اقبال۔ ملکۂ غزل اور ملکہ ترنم نے جو کمال دکھایا ہے اُسے آپ ازسرِ نو محسوس کریں گے۔

مالگنجی کی مہکاریں اس تگڈم سے پھوٹ پھوٹ پڑتی ہیں اور اس مہکار سے سرگم کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ استھائی انترے کے ہر ہر پہلو میں دونوں مغنیاؤں نے پورا پورا انصاف کیا ہے اور سلیم اقبال کے تخلیقی ذہن سے کشدہ جمال کو اظہار کا پیرایہ دیا ہے ''سوتن دوارے'' کہنے کی ادائیگی اپنی مثال آپ ہے۔

کلکتہ کہ شہر موسیقاراں۔ شہر فنکاراں۔ شہر خوباں۔ شہر بُتاں۔ شہر معشوقاں۔ شہر نگاراں ہے۔ غالب نے اپنے اشعار میں جن چند شہروں کو خراج تحسین پیش کیا ہے (اردو اور فارسی ہم دو کلام میں) اُن میں دلی کے علاہ بنارس اور کلکتہ بھی شامل ہیں تعالیٰ للہ۔ ملاحظہ فرمایئے گا۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تم نے ہم نشیں !
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ، ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُنکی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ انکا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے نابِ گوار کہ ہائے ہائے

Scanned with CamScanner

بالیقین مرزا نوشہ کے اس خراج میں جب کبھی گویر جان کلکتے والی اور پھر دہائیوں بعد زہرہ بیگم کلکتے والی کے نہایت نہایت سُریلے سرہم آہنگ ہوئے ہونگے تو کہا سحر آگیں کیا شہد آگیں فضا بنتی ہوگی۔ اور اب بھی غالب کے اشعار کی گونج کلکتہ کی فضاؤں میں بالیقین موجود ہوگی بعینہ موخرالذکر دونوں مغنیاؤں کی امواجِ صدا تموجِ صوت وندا فضا میں تیرتے ہوں گے۔ قلندروں۔ دیوانوں۔ مستانوں۔ پروانوں کا زمانہ ایک ہی ہوا کرتا ہے وائی سا دور چاہے کوئی بھی ہو۔

ہماری زیرِ موضوع مغنیہ ملکہ غزل فریدہ خانم بھی اسی تیر انداز شہر میں پیدا ہوئیں۔ کم سنی میں دلی آگئیں۔ کم سنی ہی میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہونیوالی موسیقی سے بوساطت سماعت انکی تربیت شروع ہوگئی۔ گھر کا موحول تو سُر بھرا تھا ہی۔ مشاہیرِ فن کی سُریلی۔ رسیلی اور رس بھری نشستوں کے پالنے میں پلی بڑھیں۔ عہد ساز مغنیہ مختار بیگم (المعروف مختار بیگم امرتسر والی) انکی بڑی ہمشیرہ تھیں۔ اور یوں اساتذۂ فن انہیں گھر کی دہلیز اندر سے میسّر آگئے۔ دلی میں چند سالوں کے قیام کے بعد امرتسر چلی آئیں۔ اپنے عہد کے نامور گی اُستاد خانصاحب عاشق علی خاں صاحب پٹیالے والے کی تلمیذہ ہوئیں۔ اکتساب فن امرتسر میں جاری رہا اور پھر جب انکا خاندان امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آبسا تو ادھر بھی مذکورہ خانصاحب سے اکتساب علم وفن جاری رہا۔ خانصاحب 1948 میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے (خانصاحب کی بھی اپنی ایک الگ ہی دنیا تھی ایک الگ کہانی ہے) خانصاحب کی وفات کے بعد فریدہ خانم کا اپنی بڑی ہمشیرہ مختار بیگم کے ساتھ رشتہ تلمذ مستحکم تر ہوتا گیا۔

اپنے اُستادِ محترم خانصاحب عاشق علی خاں کی اخری آرام گاہ بھی اُنکی اب تلمیذۂ خاص نے بڑی لگن عقیدت اور محبت سے تعمیر کروائی۔ چیمبرلین روڈ پر ایک دیرینہ تکیے سے اندر صحن میں خاں صاحب آسودۂ خاک ہیں کتبے پر مرقوم ہے۔

تعمیر کنندہ فریدہ خانم ع لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا

1950ء میں ریڈیو پاکستان لاہور سے انکی مسحور۔ مدھر گائیکی کا آغاز ہوا۔ زیڈ اے بخاری اور انکے دیگر نابغہ احباب کی تربیت نے انکے فن کو جلا بخشی ادھر مختار بیگم جیسی نابغۂ روزگار گائیکہ سے جمالِ فن کشید کرتی رہیں۔

ریڈیو سے متنوع اصناف موسیقی (غزل۔ گیت۔ کافی۔ لوک گیت۔ نیم کلاسکی موسیقی میں رچے بسے نغمات) نشر کرتی رہیں اور سامعین کے دلوں پر حکمرانی کرتی رہیں۔

ٹی وی کی آمد کے ساتھ ہی اپنی جمال انگیز شخصیت اور فن سے ٹی وی کی سکرین کے حسن میں ایزادِ متصل کیا۔ تمام اساتذۂ فن نے اُنکی شدھ گائیکی ہنرمندی اور منفرد اسلوب کے سبب انہیں ''ملکہ غزل'' تسلیم کیا ہے۔

1953ء (شاید پہلے بھی یہ پہلو مرقوم ہے) صرف ایک فلم ''سیلاب'' میں اداکاری کی اور 1963ء میں ملکہ ترنم نورجہاں کے ساتھ نیم کلاسیکی کے خوبصورت رنگ میں رنگا ہوا سدا بہار نغمہ گایا۔ فلم کے لیے معدود چند۔ ٹی وی کے لیے بہت اور ریڈیو پاکستان لاہور

Scanned with CamScanner

سے (دیگر ریڈیو اسٹیشنز سے کم) کثیر تعداد میں غزلیں اور گیت براہِ راست بھی نشر کئے اور اچھی خاصی تعداد میں بوساطت ریکارڈنگ ریڈیو کے خزانہ میں بہت خوبصورت اضافہ کیا۔ ماشااللہ چشم بدور اُنکی شخصیت اور فن اب بھی دہائیوں قبل کی طرح ہشاش بشاش اور تروتازہ اور شاداب ہے۔

فلم سیلاب کے موسیقار اصغر علی محمد حسن تھے کاسٹ میں صبیحہ خانم۔ فریدہ خانم۔ بیگم پروین۔ ہمالیہ والا نمایاں تھے۔ فریدہ خانم نے صبیحہ خانم کی سہیلی کا رول کیا تھا۔ ان دونوں کے ترنگ آمیز مگر سادہ سے رقص پر زینت بیگم لاہور والی نے کہا خوبصورت گیت گایا تھا۔

ع نہ سمجھی کسی کی نہ مانی کسی

اس فلم میں زینت بیگم کے بڑے موثر اور دلپذیر نغمات تھے اسکے علاوہ۔ نذیر بیگم قصور والی (المعروف جیراں قصور والی) اور علی بخش ظہور کے خوبصورت نغمات بھی فلم میں شامل تھے۔

قدرے حیرت خیز پہلو یہ ہے کہ میوزک ڈائریکٹر (اصغر علی محمد حسن) نے فریدہ خانم کی آواز میں کوئی نغمہ نہیں لیا اور زینت بیگم لاہور والی کی آواز ہی دونوں سکھیوں پر فلمائی گئی ہے (اگر مجھے سننے میں کوئی غلطی نہ لگی ہو) ویسے بھی زینت بیگم لاہور والی فریدہ خانم جی کی پسندیدہ فلمی گائیکہ تھیں۔ اس پہلو کا ذکر زیر موضوع مغنیہ نے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں کیا تھا۔

اغلباً فلم ''سیلاب'' کے بعد زینت بیگم آف لاہور کا نام نامی کبھی پردۂ سکرین پر بطور پلے بیک نظر نہیں آیا۔

کیا خوبصورت موثر۔ بھرپور پرگداز۔ دلپذیر اور سُر ملا گلا عطا کیا تھا اللہ نے زینت بیگم (لاہور والی) کو۔ آپ کہاں چلی گئیں۔ زینت بیگم جی۔۔۔۔؟۔۔۔ کہاں ہیں آپ۔۔۔۔۔؟

ع تم نجانے کس جہاں میں کھو گئے

فلم ''سیلاب'' کے بارے میں ٹیلی ویژن پر صبیحہ خانم نے اپنی پُرانی دھندلی سی یادداشتیں سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔

''اس فلم کی تفصیل کچھ خاص یاد نہیں آ رہی بس یہ یاد ہے جب ہمیں پتہ چلا کہ بہت بلند پایہ گانے والی ایک گائیکہ فریدہ خانم ہمارے ساتھ کام کر رہی ہیں تو بے حد خوشی ہوئی۔ چلو انہیں سنیں گے۔ دیکھیں گے ملیں گے خوش قسمتی سے اُن سے باتیں بھی ہوں گی''

فریدہ خانم نے اسی حوالے سے اپنی یادداشتیں یوں تازہ کیں۔

''میں بہت EXCITED تھی کہ فلم سیلاب میں مجھے صبیحہ خانم جیسی عظیم حسین و جمیل فنکار کے ساتھ کام کرنا ہے۔ چلو جی اسی بہانے ہم اُن سے ملتے رہیں گے اُنکی حسین شخصیت دیکھیں گے۔ بہت یادگار لمحات تھے میرے''

فریدہ خانم نے ایک ہی فلم (پہلی اور آخری) سیلاب میں اداکاری کی اس سے قبل چند فلموں میں انہوں نے صرف غالباً کاغذی

Scanned with CamScanner

کاروائی یعنی سائن ہونے تک کام کیا تھا۔ ''روپیہ'' نامی ایک فلم البتہ بڑی مختصر سی ہی تھی (قریباً پینسٹھ سال قبل) فریدہ خانم کا تعارف فلمی صحافت میں ''فریدہ نیلی'' کے نام سے ہوتا رہا مگر جلد ہی یہ نام مفاکِ خمول میں نہیفتہ ہو گیا۔

فریدہ خانم سیلاب کے بعد کبھی پردۂ سیمرا پر نظر نہ آئیں۔ اور فریدہ نیلی بھی وہیں کہیں رہ گئیں اور فریدہ خانم پہلے نامور گلوکارہ فریدہ خانم کے طور پر سامنے آئیں اور پھر ملکۂ غزل۔ فریدہ خانم۔ 1961ء سے 1974ء (تیرہ سال عرصہ) تک انہوں نے ایک محتاط ترین اندازے مطابق 12 فلمی نغمات گائے (آٹھ اردو اور چار پنجابی)۔ یہ فلمی دنیا کو ملکۂ غزل کی دی گئی ایک خوبصورت سوغات سمجھ لیجیے گا۔

مختصر سی فلموگرافی اور فلمی نغمات کی مختصر ہی فہرست آپکو مضمون کے آخر میں بصورت جدول ملے گی۔ ملاحظہ کر لیجئے گا۔

''ارے دیکھو تو سنو اجے دونوں لڑکیاں کیا اچھا گا رہی ہیں ابے غور تو کر یہ بسنت ہے یا پوریا دمناسری۔ اجے سُن۔ دھیان دے۔ دونوں لونڈیاں کیا غضب کا گا رہی ہیں۔'' کلو میاں مجھے مسلسل کہہ رہے تھے۔ یہ گانا نشر ہو رہا تھا۔

برس برس رہے شادماں ترِی نظر اتارے آسماں برس برس۔۔۔!۔۔!

ایک زمانے میں ریڈیو ہیڈ کوارٹر ڈاک خانے سے ذرا آگے کلو میاں پان سگریٹ کا کھوکھا لگایا کرتے تھے۔ اُن سے یاد اللہ ہو گئی تھی۔ قریب ہی چائے کا ایک چھوٹا سا سٹال بھی تھا۔

اُنسے بہت تھوڑی ملاقاتیں رہیں۔ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ بعد کو پتہ چلا کہ راگ رنگ کے حوالے سے بڑے پایہ کے عالم تھے اور خود کچھ عرصہ سردار خاں صاحب دہلی کے شاگرد بھی رہ چکے تھے سردار خاں دہلی والے کا ذکرِ خیر چھڑ گیا تو مجھے بڑے میاں ؒ کا خواب نما زمانہ یاد آ گیا۔ دونوں دلچسپ شخصیات کا اجمالی دلچسپ ذکر آپ آنیوالے (پکھراج پیو اور سلمٰی بیگم کے بعد) مسّو بائی MISSOBAI کے تذکرے میں ملاحظہ فرمالیں گے۔

تو بات اُن کلو میاں کی ہو رہی تھی چالیس برس قبل انہوں نے ریڈیو سے نشر ہونیوالے اس خوبصورت نسوانی دوگانے کے فنی محاسن کی طرف اس خاکسار کی توجہ مبذول کروائی تھی تو میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ فلم ''میں وہ نہیں کا یہ خوبصورت گیت ریڈیو لاہور سے نشر ہو رہا تھا (نغمہ نگار۔ حمائت علی شاعر اور موسیقار اے حمید۔ 1967ء) فریدہ خانم اور نسیم بیگم کی انتہائی خوبصورت سریلی سنگت۔ کیا کہنے۔ سبحان اللہ!

اس نہایت خوبصورت اور منفرد سے سُریلے نغمے کے اسکی طرز اور شاعر کے محاسن تھوڑے سے حسب توفیق آئندہ سطور میں نذر قارئین کروں گا۔

Scanned with CamScanner

مگر جوں جوں مجھے اُن کلّو میاں کے علم وفضل اور سُر ساگر کے شناور ہونے کا علم ہوتا چلا گیا توں توں میری حیرت اُنکے ساتھ محبت وعقیدت میں متبدل ہوتی گئی۔ اُن دنوں کلّو میاں کی عمر کم وبیش ستر کے پیٹے میں رہی ہوگی۔

گھنیر بال۔ بوٹا سا قد۔ نیم فربہ جسم۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ مناسب مونچھیں شیوا کثر بڑھی ہوئی۔ پان سے کلے ہمہ وقت بھرے ہوئے۔ لبوں کے گوشے گہرے احمریں احمریں رہتے گویا آشا بھونسلے نے یہ نغمہ انہی کے لئے گایا تھا

پان کھائیں سیاں ہمارو سانولی صورتیا پہ ہونٹ لال لال

بولنے کی آواز نہایت پرکشش نتھرا شفاف دُھلا ھوا لہجہ گویا دل کے فصیل اندر کا پتہ دیتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ آن کی آن میں بھک کر کے اڑ گیا۔ زیادہ قربت نصیب نہ ہو سکی۔ تب ہی اڈاری مار گئے

تری قربت کے لمحے پھول جیسے مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

یہ نغمہ آج بھی سنتا ہوں تو کشاں کشاں میں از خود تصوراتی طور پر اُس پان سگریٹ اور چائے والے سٹال کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

فی الحقیقت یہ ایک شاہکار اور منفرد نغمہ ہے۔ اے حمید کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں بہت اعلیٰ Contribute کر گئے اور ربانی خاندان کا نام ہمیشہ انہوں نے بلند رکھا۔ بڑی خوبصورت طرزیں تخلیق کیں مگر اُنکے اس نغمے کی بات ہی اور ہے۔ طُرفہ طرز ہے اسکی واقعی اور تخلیقِ فن میں OXYMRON کی ایک عمدہ مثال۔ بار بار سننے کو جی چاہتا ہے۔

ہلکی سے مختصر ترین جھنکار کے ساتھ زمزمہ سازی کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر دونوں مغنیائیں (فریدہ خانم اور نسیم بیگم) نہایت شفاف آکار کے ساتھ کیا جمال انگیز تان لگاتی ہے اور اسی میں راگ کا تعارف کروا دیتی ہیں گویا راگ کی شکل کی اجمالی جھلک دکھاتی ہیں طبلے کی گت توڑے کے ساتھ اور مخصوص تال کے فنکارانہ باج کے ساتھ گھنگھروؤں کی لاجواب ہم آہنگی اور پھر میوزک ڈائریکٹر نے ستار کے ٹکڑے نگینے کی طرح جڑے ہیں اور ستار نواز نے (جو بھی یہ ہیں) جڑیئے ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔

ستار کے سُریلے ٹکڑوں کے ماہرانہ باج راگ کو مسلسل متعارف کرواتے رہتے ہیں شاعری بھی سادہ مگر بلاغت آمیز حمایت علی شاعر کی تخلیق خود اپنے اشعار سے اپنا تعارف کرواتی رہتی ہے۔

عجب پہلو یہ ہے کہ نغمے کی فلمی سچوشن مسرت انگیز ہے انبساط آمیز ہے جیسے کوئی جشنِ ولادت جشن سالگرہ ہو یا کسی ایسی ہی تقریب کا اہتمام ہے ماحول خوشگوار۔ طرز بھی تاثر بھی خوش کن معاً اداس کر دینے والا اور یہ افسردگی آمیز کرامت نغمے کی طرز میں مضمر ہے۔ نغمے کے آغاز (تان سے سم تک) سے اختتام تک ایک ملوف افسردگی اپنی غمازی کرتی رہتی ہے۔ پھر گائیکائیں جو جمال وکمال دکھاتی ہیں وہ شنیدانی ہے بس۔!

ایک ترنگ۔ ایک امنگ۔ ایک خواہش۔ ایک تمنا۔ ایک التجا۔ ایک دعا۔ اداسی۔ ایک نامحسوس سی افسردگی۔

Scanned with CamScanner

ان تمام جملہ عناصر نے سیر و شکر ہو کر اس نغمے کو بلاشبہ ایک ہشت پہلو نگینہ بنا دیا ہے۔
طرز اور گائیکی بوساطت سطور پیش نہ کرنے کی معذرت مگر نغمے کو پڑھنے کا اہتمام کئے دیتے ہوں۔

لیجیے ملاحظہ فرمایئے گا

برس برس رہے شادماں — تری نظر اتارے آسماں
شام سی رنگین سحر ہو — کاہکشاں تیری راہگذر ہو
ہنستے گاتے عمر بسر ہو — سورج بھی ہو کارواں
ایسا اثر ہو میری دعا میں — نام ترا چمکے دنیا میں
شمع یہ روشن رہے ہوا میں — تیرا خدا ہو پاسباں
برس برس رہے شادماں

دوسرے انترے میں (جو آخری بھی ہے) عجیب خفی خفی سا التجائیہ اسلوب ہے یہی پر گائیکی چہار چند ہو جاتی ہے۔ نغمے کا اختتام فریدہ خانم کی بڑی ہی خوبصورت اور دلکش مدھر تان پر ہوتا ہے۔ کھرج سے نکھاد تک جاتے ہوئے لحظہ لحظہ اُنکی گائیکی کا حُسن مہک مہک اٹھتا ہے۔ میں یہ نغمہ اب بھی بڑی ہی محویت اور سیکھنے کے سے انداز میں سنتا ہوں۔

فلم پاکیزہ، میں سلیم اقبال کی موسیقی میں انہوں نے بہت عمدہ Contribute کیا اس طرح گنی موسیقار وزیر افضل کی طرز میں فلم پردیسی کا نغمہ بھی غضب کا ہے۔ ع وے جاگیں ویرا بھین جگاوے تینوں

جب بھی کسی فنکار یا فنکارہ کی شخصیت اور فن کو سپردِ قلم کرتا ہوں تو بخدا کماحقہٗ سعی ہوتی ہے کہ اُنکے گائے ہوئے نغمات متنوع حوالوں سے سنے جائیں اگر ایسا نہ ہو سکے تو اُنکے منتخب نغمات پر پوری توجہ دی جائے تا کہ گائیک یا گائیکہ کے فن کے تذکرے سے دیانت داری کی مہک آتی رہے۔

زیر موضوع مغنیہ کے تقریباً (اگرچہ تعداد نہایت قلیل ہے) تمام نغمے از سر نو سنے فلم ''میں وہ نہیں'' کا نسوانی دوگانا (فریدہ خانم اور نسیم بیگم کی سنگت) بار بار سننے کو جی چاہتا ہے۔

فریدہ خانم کی شخصیت اور فن کا یہ اجمالی سا پُر جمال تذکرہ اپنے تکمیلی مراحال کو پہنچ رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر کیسٹ CUE کر کے مذکورہ نغمہ سننے لگا کہ موبائیل کی گھنٹی بجی۔۔۔Cell Screen پر ڈاکٹر عمر کا نام دمک رہا تھا۔ یہ ہمارے بہت ہی لاڈلے اور پیارے دوست ہیں پورا نام عمر الدین ہے کالج کے شعبہ انگریزی سے منسلک ہیں۔

Scanned with CamScanner

دوپہر کے ایک بجے کا عمل تھا موبائیل آن کیا۔ ہیلو ہائے علیک سلیک کے بعد میں نے کھٹ سے کہا

''لو جی! عمر جی ہمارے پاس تو یہی کچھ ہے لو سنو'' یہ کہتے ہوئے مذکورہ نغمہ کیسٹ پلیر پر آن کر دیا

ع برس برس رہے شادمان

اور موبائیل سپیکر سپیکر کیذ راقریب کر دیا۔ بہت ہی مختصر سی جھنکار کے بعد پٹیالہ گھرانے کی نامور گنی گائیکاؤں کی خوبصورت لجی تان آئی اور گھنگھرو اور طبلے کی کمال آہنگی نے اپنا رنگ جمایا استھائی کے بول شروع ہونے سے قبل ہی میں نے ٹیپ پلیئر آف کر دیا۔ اور استفسار کیا

''ہاں جی عمر سنا''

''ہاں۔ دن کے وقت بھی کتنا سوز ہے اس نغمے میں۔ سر نہ سنا کریں ایسی چیزیں''

بس اُسنے یہ فقرہ کہا۔

خدا معلوم آن کی آن میں ڈاکٹر عمر کے باطن سے یہ کونسا عمر نمودار ہوا تھا۔ نجانے یہ کون سا عمر تھا۔ لہجہ بھی بجھا بجھا تھا۔

''۔۔۔۔ ہیں۔۔۔! عمر کیا کہہ گیا ہے۔ کتنی چونکا دینے والی بات کر گیا ہے عمر''

میں نے ایک لمبی سے ''ہیں'' کہتے ہوئے خود ہی خود سے کہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ عمر ہے۔ خدانخواستہ مرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ خوش ذوق نہیں یا پھر مطالعہ اور موسیقی کا اُسے عمدہ ذوق نہیں یقیناً دونوں میں وہ اچھا خاصا خوش ذوق ہے اور ماشااللہ بطور اُستاد انگریزی ادبیات بھی وہ بہت اچھی Repute اچھا تاثر Enjoy کر رہا ہے۔

مگر موسیقی کے حوالے سے یہ جو ہو حیران کر گیا تھا بلکہ سچ پوچھیں تو پریشان کر گیا تھا یہ کہہ کر

''دن کے وقت بھی کتنا سوز ہے اسمیں''

اس پر میں بھی انگشت بدنداں تھا اور اب بھی وہ لمحے یاد آتے ہیں تو حیرت و مسرت کی کیفیت مجھے تھوڑی دیر کے لیے مغلوب رکھتی ہے۔

وہ یا میرے مولا اتنا باریک پہلو عمر کو یہ کیسے پتہ چلا کہ اتنا سوز ہے۔ اس تان میں اس راگ میں۔ اس گائیکی میں۔ اُسکے کان استعد رُسر شناس ہیں؟؟۔۔؟؟ تھوڑی ہی دیر بعد اُسکے کن رسیے ہونے کو Cell پر ساطت Message یوں Complimant دیا۔ مسکراتے ہو یہ Message ٹائپ کر کے اُسے بھیج دیا۔ ''خاں صاحب! آپکا گھرانہ کونسا ہے۔۔۔!!''

یقیناً میں بھی یہ پوچھتے ہوئے بہت ترنگ میں تھا اور وہ بھی بالیقین خوش ہوا ہوگا میرے اس اشعار پر۔ اسلئے کے فنی طور ہم دونوں ''جے گھر'' ہیں اپنے عزیز دوست کے کن رسیے کو توحسب توفیق ایک conpliment پیش کر دیا تھا۔ ایک بے تکلفی نے یہ بات کہلوادی مگر ادھر ملکۂ فریدہ خانم (ہمراہ نسیم بیگم) کے فن کو اُنکا مجھ جیسا ناچیز پرستار کیا خراج عقیدت کیا خراج تحسین پیش کر سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ع کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

فی الحقیت وہ مذکورہ Message بھیجنے کے بعد میں کئی گھنٹے تک وہ اپنا محبوب و مرغوب نغمہ نہ سن سکا۔ اور ابھی ادھر یہ مضمون لحظہ لحظہ اپنے اختتام کی طرف جا رہا ہے اور میں نے دھیمے دھیمے سے Voleeme میں یہ نغمہ لگا دیا ہے۔ کانوں کے لیے امرت اور آنکھوں کے لیے افسردگی کا سندیسہ۔

نسیم بیگم (سبحان اللہ کیا بے مثل فنکارہ تھیں) تنتالیس برس ہوئے ہمیشہ کے لے سو گئی تھیں۔ اللہ اُنکے درجات بلند فرمائے آمین!

اور محترمہ فریدہ خانم کو اللہ پاک صحت مند رکھے۔ برس برس شادمان رکھے۔ مدھر تانوں میں ایک خوبصورت طرز کی جلوس

کانوں میں رس بھری آوازیں آ رہی ہیں۔ آپ بھی سنیے گا۔۔۔ جی۔۔۔

مگر یہ کون ہے جو اسی نغمے کو تحت اللفظ کہہ رہا ہے یہ بھی سنیے گا۔

یہ میں ہوں۔ انکا ایک حقیر دعا جز پرستار عالم تصور میں فریدہ خانم ہی کو تو کہے جا رہا ہوں کہ

ع برس برس رہے شادمان۔

برس برس رہے۔ تو

FILMOGRAPHY

(اردو)

نمبر	فلم	ہدایت کار	موسیقار	سن
1	شیرِ اسلام	ایم۔ جے رانا	اعظم بیگ	1961ء
2	باجی	سلیمان	سلیم اقبال	1963ء
3	میں وہ نہیں	لقمان	اے حمید	1967ء
4	پیاسا	نذر اسلام	سُبل داس گپتا	1969ء
5	پاکیزہ	لقمان	سلیم اقبال	1969ء
6	قسم اُس وقت کی	اے جے کاردار	سہیل رعنا	1969ء

(پنجابی)

نمبر	فلم	ہدایت کار	موسیقار	سن
1	دُکھ بجناں دے	---	سلیم اقبال	1968ء
2	پردیسی	---	وزیر افضل	1970ء
3	بازی جت لئی	راجہ حفیظ	غلام حسین شیشر	1972ء
4	رانو	خالد چودھری	طالب جعفری	1974ء

Scanned with CamScanner

نغمات

(اردو)

نمبر	بول	شاعر	موسیقار	فلم	سن
1	رنگ ایسا میرے شباب کا	قتیل شفائی	اعظم بیگ	شیرِ اسلام	1961ء
2	میرے دل پہ چٹکتی ہیں کلیاں	قتیل شفائی	اعظم بیگ	شیرِ اسلام	1961ء
3	زلفوں کو زنجیر بنا کے	قتیل شفائی	اعظم بیگ	شیرِ اسلام	1961ء
4	سجن لاگی توری لگن من ما (ہمراہ نوجہاں)	احمد راہی	سلیم اقبال	باجی	1963ء
5	برس برس رہے شادماں (ہمراہ نسیم بیگم)	حمائت علی شاعر	اے حمید	میں وہ نہیں	1967ء
6	اب چھوڑ نہ جانا مورے سیّاں	تنویر نقوی	سلیم اقبال	پاکیزہ	1968ء
7	تیرے لیے مصیبت اٹھائی ہے	سیفؔ	سبل داس گپتا	پیاسا	1969ء
8	سب قتل ہو کے تیرے مقابل	فیضؔ	سہیل رعنا	قسم اُس وقت کی	1969ء

(پنجابی)

نمبر	بول	شاعر	موسیقار	فلم	سن
1	تیرے باجھ سی چپ بیدردا	روف شیخ	سلیم اقبال	دُکھ سجناں دے	1969ء
2	دے جاگیں ویرا بھین جگاوے تینوں	خواجہ پرویز	وزیر افضل	پردیسی	1970ء
3	نی مینو نچ کے یار منالین دے	آشفتہ	غلام حسین شبر	بازی جت لئی	1972ء
4	ایس جگ تے آونا سوکھا	مظہر کاظمی	طالب جعفری	رانو	1974ء

☆☆.....☆☆☆.....☆☆

Scanned with CamScanner

اکبر لاہوری

ملتے ہیں ایسے لوگ جہاں میں نصیب سے

ناصر زیدی

ایک مشہور زمانہ بلکہ ضرب المثل شعر ہے:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اس شعر کے خالق بلکہ اس جیسے سینکڑوں ناقابل فراموش اشعار کے خالق الہ آباد کے حضرت اکبر حسین تھے، جن کا نام اکبر الہ آبادی کے نام سے "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" کی شکل میں جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔

الہ آباد سے ہٹ کر اپنے اس "شہر زندہ دلان لاہور" میں اکبر تخلص کے کئی نامور شاعر ہو گزرے ہیں جو اپنی اپنی جگہ دُبِّ اکبر تھے۔ ان میں ایک اُستاد فن سخنورِ بے بدل جلال الدین اکبر تھے جن کا ایک مطلع اُن کے پورے دیوان پر بھاری چلا آ رہا ہے اور اہل ذوق کے دلوں پر مُدت مدید سے راج کر رہا ہے:

ہر لحظہ ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
واللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

اور پھر ایک اور بھی اکبر ہوئے۔ اکبر کاظمی جو چھوٹے قد کے قد آور اور طرحدار شاعر تھے۔ اُن کا ایک شعر یاد آیا:

اُکتا کے نہ سو جانا کل پر نہ اُٹھا رکھنا
شاید میں چلا آؤں دروازہ کھلا رکھنا

ان سب سے بڑھ کر ایک اور اکبر تھے اکبر لاہوری اُنھوں نے مجید لاہوری اور طاہر لاہوری کی طرح لاہوری کے لاحقے کو تمام

مرزا جاں بنائے رکھا' یوں تو شروع شروع میں سیّد عابد علی عابدؔ کو بھی بعض مقامات پر عابدؔ لاہوری کے نام سے یاد کیا گیا اور ایران والے تو اپنے علامہ اقبالؔ کو اب تک اقبالؔ لاہوری کے نام سے پکارتے ہیں۔ اکبرؔ لاہوری بقول خود علامہ تاجورؔ نجیب آبادی کے شاگرد تھے اور اُن کی شاگردی کا نہ صرف دَم بھرتے تھے بلکہ اس نسبت سے فخر محسوس کرتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا:

سب نے تسلیم کیا تاجورِ مُلکِ سخن
بزم میں جب کبھی اکبرؔ مرا اُستاد آیا

اور یہ بھی کہ:

ایک عالم کو ہے معلوم حقیقت کی طرح
میرا ادنیٰ مرے اُستاد کا اعلیٰ ہونا

انھی اکبرؔ لاہوری کا اپنے کلام کے حوالے سے ارشاد ہے۔

اکبرؔ مرے کلام کی تعریف ہو نہ ہو
واللہ واردات رقم کر رہا ہوں میں

اس شعر کے کلیدی لفظ ''واردات'' پر اکبرؔ لاہوری کے اردو دیوان کا نام ہے۔ جو اُن کے ایک صاحبزادے حمید اکبر بھٹی (حمید الدین بھٹی) نے بعد از مرگ شائع کرایا۔ اکبرؔ لاہوری کے ایک بیٹے بیراجیؔ بھی شاعر ہیں اور ایک بیٹی ہجویری بھٹی بھی اپنی پنجابی شاعری کے ناتے معروف ہیں' بیراجیؔ ماشاءاللہ فعال ہیں' اکبرؔ لاہوری فاؤنڈیشن قائم کئے ہوئے ہیں۔ وہ ''واردات'' کی اشاعت' سرورق کے اہتمام اور پروف خوانی کے ذمہ دار تھے معاونت میں ایک اور بیٹے کندن لاہوری کا نام بھی ملتا ہے۔ حمید اکبر بھٹی نے لکھا ہے: اکبرؔ لاہوری میری زندگی کے لئے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے تھے' اُن کی راہبری سے ہی میں سکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی سے عدالت کی کرسی پر بیٹھ گیا''۔۔۔۔!

اکبرؔ لاہوری جو دراصل چودھری محمد اکبر خاں بھٹی ولد محمد ابرہیم خاں بھٹی تھے۔ 8 جولائی 1910ء کو مرل پار بھٹیاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ والد سب انسپکٹر پولیس تھے' خود بھی اکبرؔ لاہوری نے تکمیل تعلیم کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی اور انگریزوں کے دور میں کلاس ون افسر رہے' بعد ازاں آخر دم تک لاہور میں وکالت کرتے رہے' درمیان میں وہ بسلسلہ ملازمت لاہور سے باہر کہیں بھی گئے لاہور کو دل میں بسائے رکھا:

یادِ لاہور سدا ساتھ رہی ہے اکبرؔ
کر کے اس شہر سے جب ترکِ سکونت نکلے

Scanned with CamScanner

ہم نے اکبر لاہوری کو ۶۰ء کی دہائی سے حلقہ ارباب ذوق اور دیگر ادبی تنظیموں میں اور مشاعروں میں سرگرم عمل دیکھا۔ جب تک اُن کی صحت ٹھیک رہی اور دم میں دم رہا یعنی 24 ستمبر 1976ء تک وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک وہ حلقہ ارباب ذوق میں آتے جاتے رہے۔ ہم نے جب جب حلقے کے اجلاس میں شرکت کی اُنھیں ہی تنقید کا آغاز کرتے ہوئے پایا۔ اکثر اوقات خود صاحب صدارت اُنھیں دعوت دیتے کہ ''اکبر لاہوری صاحب! کچھ ارشاد فرمایئے'' اور پھر وہ شروع ہو جاتے تو وقفہ حاصل کرنا مشکل ہو جاتا' وہ اجلاس کوئی ٹی وی مذاکرہ تو ہوتا نہیں تھا کہ جب ذرا محفل رنگ پہ آئی جھٹ اینکر پرسن نے بریک لے لی۔ اکبر لاہوری کی گفتگو بغیر بریک کے جاری رہتی اور سامع کو سکنے نہیں دیتی تھی۔ رہی سہی کسر پاک ٹی ہاؤس میں چائے کی میز پر نکالی جاتی اور ایک پیالی چائے میں اچھا خاصا ادبی طوفان اُٹھایا جاتا۔

یہاں مجھے اکبر تخلص والے لاہور کے ایک اور شاعر یاد آ گئے۔ بڑے ہی سلیم الطبع' مرنجاں مرنج قسم کے شاعر تھے اکبر سلیم۔ یہ محکمہ اطلاعات میں غالباً اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے' شعر کہتے تھے مگر باقاعدہ شاعر کے طور پر شہرت نہ پا سکے۔ اُن کا ایک شعر حافظے میں محفوظ ہے:

جو بھی حساس ہے زمانے میں
اُس سے کہہ دو کہ گھٹ کے مر جائے

یہاں میں نے اب تک جلال الدین اکبر' اکبر کاظمی اور اکبر سلیم کا ضمناً ذکر کیا اصل ہدف تر سرِ دست اکبر لاہوری ہیں' بہر حال اِن سب اکبروں سے میری نیاز مندی تعلقِ خاطر اور اکبر کاظمی سے تو دوستی بھی رہی۔! اکبر لاہوری اُردو' پنجابی' فارسی' انگریزی زبانیں بخوبی لکھ پڑھ سکتے تھے تاہم اُن کی شاعری زیادہ تر پنجابی اور پھر اُردو میں ہے اُن کی نظم ونثر کی دو تین کتابیں اُن کی زندگی میں شائع ہو سکیں ''موجِ تبسم'' اردو مزاحیہ کلام پر مبنی اور ''اکبر کہانیاں'' اور چھوٹی کہانیاں'' پنجابی میں۔ حمید اکبر بھٹی کے مطابق اکبر لاہوری نے اپنا سارا کلام اور ادبی مواد اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ اُن کی پانچ کتابیں چھپنے کے مراحل میں ہیں' جن میں شاعری کی ''چمنِ نظم'' اور راوی دیاں رمزاں'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اکبر لاہوری کی اُردو شاعری کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی نے ''واردات'' کے فلیپ پر یوں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

''اکبر لاہوری متنوع حیاتِ ادب کے ایک محترم تخلیق کار تھے' اُردو پنجابی دونوں زبانوں میں روانی اور بلاغت سے شعر کہتے تھے' ان کا اُردو دیوان قدیم دواوین کے انداز میں ہے' اِن غزلوں کا انداز اُس اسلوب غزل (کلاسیک) کے عین مطابق ہے مگر کہیں کہیں وہ اپنی بات اتنی ذہانت اور سلیقے سے کہہ جاتے ہیں کہ اُردو کی جدید غزل کا انداز سامنے آ جاتا ہے۔ اکبر لاہوری کو فراموش کر دینے کا گناہ اُن کے اس دیوان کی اشاعت کے ساتھ ہی دُھل گیا ہے''۔۔۔![اقتباس ختم]

Scanned with CamScanner

اور میں سمجھتا ہوں کہ اب اکبرؔ لاہوری کی روح یقیناً شاد ہوگی کہ انھیں اُنکے تعام ومرتبے کے مطابق یاد کیا جارہا ہے۔ شاید اُن کے اِس گِلے کی کسی حد تک تلافی ہو سکے کہ:

؎ اکبرؔ کی تم نے قدر نہ جانتے ہوئے
ملتے ہیں ایسے لوگ جہاں میں نصیب سے

غزل کے لئے ''قافیہ پیمائی'' کی پھبتی ہر منفرد مزاج وآہنگ کے شاعر ناصر کاظمی مرحوم نے بھی کہا تھا:

؎ کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ!
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

اکبرؔ لاہوری نے شعر گوئی کا اپنا نظریہ یُوں بیان کیا ہے:

؎ آدمی شعر کہے جذبۂ دل سے اکبرؔ
مفت الزام نہ لے قافیہ پیمائی کا

اور یہ بھی کہ:

؎ غالبؔ وتاجورؔ ومیرؔ کے گلدستوں کا
دل میں دیوان سجا ہو تو غزل ہوتی ہے
فیض اُستاد بھی شامل ہو تو بنتی ہے غزل
عاشقی راہ نما ہو تو غزل ہوتی ہے

اکبرؔ لاہوری کے مجموعہ غزل ''واردات'' سے غزل کے کچھ اور اشعار:

؎ آپ کے حسنِ سماعت نے اسے سمجھا غزل
گُھپ اندھیرے میں مگر گھبرا کے چلاتا ہوں میں

؎ اکبرؔ پیام عشق کی تعبیر دیکھنا
وہ آپ آگئے مرے خط کے جواب میں

؎ پایا ہے زمانے میں شرف بے ہنروں نے
ہم عیب کی مانند چھپاتے ہیں ہنر آج

ملازمت اور وکالت کے پیشے میں نیک نام رہتے ہوئے اکبرؔ لاہوری طبعاً قناعت پسند اور نفس مطمئنہ کے حامل شکر گزار شخص

تھے رو کہتے تھے:

جو کچھ ملا ہُوا ہے کروں گر اُسی کا شکر
کچھ اور مانگنے کی نہ فرصت ملے مجھے

اکبر لاہوری شاعروں میں اپنا کلام عموماً لہک کر اپنے مخصوص ترنم سُناتے تھے۔ ایک زمانے میں اُن کی ایک پنجابی غزل "اودوں سانوں خط لکھنا"۔ کی ردیف میں بے حد مقبول رہی اس کی اکثر فرمائش ہوتی تھی، ہم نے خود کئی بار فرمائش کر کے سُنی ایک شعر اس وقت یاد آ رہا ہے:

جدوں پکے تے مِل پین سکے اُودوں بھانویں بُھل جانا
جدوں جاوے تے نہ کوئی آوے اودوں سانوں خط لکھنا

قناعت پسند، درویش صفت، مست قلندر اکبر لاہوری صُلح کُل اور پیار محبت کے مسلک پر کاربند رہنے والے شخص و شاعر تھے:

ایک ہی مَسلک ہمارے دل کو تو اچھا لگا
پیار سے مل بیٹھنا دنیا میں اچھی بات ہے

قتیل شفائی کا منظوم خراج تحسین کتاب کے فلیپ پر درج ہے، کہتے ہیں:

وہ رونق محفل تھا
وہ پیار کا شیدائی
کرتا تھا محبت سے
یاروں کی پذیرائی
یاد آتی ہے جب اس کی
وہ انجمن آرائی
محسوس یہ ہوتا ہے
وہ ناچتے لفظوں کا
بے چین سمندر تھا
وہ مست قلندر تھا
نغمات کی خوشبو سے

Scanned with CamScanner

مہکائے چمن اس نے
جذبات کی حِدّت سے
گرمائے بدن اُس نے
لمحات کو صدیوں کے
پہنائے بَرن اُس نے
تھا شوخ بہت لیکن
جولفظ بھی تھا اُس کا
آداب کے اندر تھا
وہ مست قلندر تھا

آتی تھی نظر اُس کے
جذبات کی شادابی
چُھوٹی ہو اندھیرے مین
جیسے کوئی مہتابی
اک آنکھ جو اُردو تھی
اک آنکھ تھی پنجابی
یارو یہ حقیقت ہے
اِس مُلکِ منوّر میں
وہ فن کا سکندر تھا
وہ مست قلندر تھا

بعد موجود کے جدید پاک ٹی ہاؤس میں لاہور کی ایلیٹ کلاس کے شعراء وادبا کی ساٹھ ستر تصاویر اوپر نیچے کے منطقے میں دیواروں پر فریم شدہ آویزاں ہیں۔ اکبر لاہوری کی تصویر نہیں ہے، حالانکہ وہ باقاعدگی سے پاک ٹی ہاؤس قدیم میں آنے والے شاعر تھے۔ صوفی تبسم اور معجبی اظہر جاوید کی تصاویر بھی نہیں تھیں، وہ میں نے لگوادیں، اب اکبر لاہوری کی تصویر بھی لگوا رہا ہوں، اُن کی بیان کردہ اس سوالیہ حقیقت کے ساتھ:

ہمیشہ کے لئے چُپ ہو گئے کیا حضرت اکبر؟
تعجب ہے ابھی کل تک نظر آتے تھے شاداں سے

☆☆.....☆☆☆.....☆☆

Scanned with CamScanner

ابوالطاہر فدا حسین فدا

بھولی ہوئی صدا ہوں مجھے یاد کیجئے

عمران نقوی

ابوالطاہر فدا حسین فدا سے میری پہلی ملاقات 1990ء میں ان کے بڑے صاحبزادے طاہر ابدال طاہر کے دفتر میں ہوئی۔ ان دنوں میں نوائے وقت کے میگزین سیکشن میں بطور سب ایڈیٹر فرائض انجام دے رہا تھا۔ فدا صاحب کمال شفقت سے پیش آئے اور چائے کے ساتھ خاص طور پر موچی دروازہ کی مشہور لال کھوہ کی باداموں والی برفی میرے لیے منگوائی۔ پہلی ملاقات کے ان لمحوں کی مٹھاس آج بھی میرے لہو میں شیرینیاں سی گھول دیتی ہے۔ یہ تو بالمشافہ ملاقات تھی مگر فدا صاحب سے غائبانہ تعارف کا سلسلہ 1977ء میں آغاز ہوا، جب میں اپنے آبائی گاؤں مہمند والی (سانگلہ ہل) سے ہجرت کر کے لاہور آیا اور برادر بزرگوار ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کے ساتھ شاہدرہ میں قیام پذیر ہوا۔ بھائی جان نے ان دنوں دو جرائد ''چین با تصویر'' اور ہفت روزہ ''پاک جمہوریت'' گھر پر لگوا رکھے تھے۔ ایک تیسرا ادبی جریدہ جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ موصول ہوتا تھا ''مہر و ماہ'' تھا جس کے مدیر اعلیٰ ابوالطاہر فدا حسین فدا تھے۔ ''مہر و ماہ'' کا اجرا 1956ء میں ہوا تھا۔ غالباً یہی جریدہ تھا جس کے باقاعدہ مطالعے نے میرے اندر چھپے تخلیق کار کو حرف و معنی سے آشنا کیا۔ اس وقت مَیں گورنمنٹ ہائی سکول شاہدرہ میں جماعت ہفتم کا طالب علم تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ ''مہر و ماہ'' اپنی بے کراں روشنی سے میرے ذہن کے مخفی گوشوں کو منور کرتا رہا۔ چند برسوں کے بعد معلوم ہوا کہ فدا حسین فدا اور برادر بزرگوار کے مابین تعلقات بہت گہرے ہیں اور گوال منڈی میں محقق عصر حکیم محمد موسیٰ امرت سری کے مطب پر باقاعدہ محفلیں جمتی ہیں۔ پھر مرکزی مجلس رضا (1968ء) اور سنی رائٹرز گلڈ (1978ء) سے شناسائی ہوئی۔ یہ دونوں تنظیمیں مذکورہ بالا قابل احترام بزرگوں نے قائم کر رکھی تھیں۔

قبل اس کے کہ فدا صاحب کے فکر و فن کی بات چلے میرے حافظے میں چند واقعات محفوظ ہیں جنہیں میں احاطہ تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔ نوے کی دہائی میں جب میں روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ادبی ایڈیشن کا انچارج تھا تو ایک دن ڈپٹی ایڈیٹر سید ارشاد احمد عارف نے مجھے کہا کہ ابوالطاہر فدا حسین فدا میرے اور ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی شہید کے بزرگ دوست ہیں۔ ان دنوں شدید بیمار ہیں لہٰذا

اس چراغِ سحری سے مکالمہ کرلوتا کہ ان کی گفتگو یادگار کے طور پر محفوظ ہو جائے۔ میں نے طاہر ابدال صاحب کو فون کر کے وقت طے کرلیا۔ فدا صاحب سے جو گفتگو ہوئی اس سے چند اقتباسات میں یہاں درج کر رہا ہوں تا کہ ان کے نظریات اور فکری زاویے سامنے آ سکیں۔

''فطرت کا اصول ہے کہ شاخوں پر نئی نئی کونپلیں کھلتی رہتی ہیں، لیکن اس اصول کا بنیادی لازمہ ہے کہ کھل چکے پھول کو نئی کونپلوں کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری ادبی سماجیات میں اس بات کا رواج ہی نہیں ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر کسی نئے آنے والے کے لیے بخوشی اپنی جگہ خالی کرے۔ اگر بزرگ اپنے چہرے پر NO ENTRY کے بورڈ کی بجائے خوش آمدید کی مسکراہٹ سجالیں تو ادب میں افکار نو اور جدید نظریات خوب فروغ پا سکتے ہیں۔''

''حسد تو ہر شعبے میں ہوتا ہے مگر ادیبوں کے ہاں یہ بہت زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔ خود کو پہاڑ ایسا ثابت کرنے کے لئے دوسروں کو نیچا دکھانا اور منفی ردِعمل کے تحت دل آزاری کرنا آج کل معمول بن چکا ہے۔ پاکستان کے نام نہاد سیاست دانوں اور جعلی ادیبوں نے قوم کو تباہی کی طرف دھکیل دیا ہے جنھوں نے کبھی اصل حقائق کو سامنے لانے کی ہمت نہیں کی اور حقیقت پسند لوگوں کو کبھی آگے نہیں آنے دیا۔ ایسے لوگ اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو راہ حق کی طرف چلے ورنہ باقی تو اپنے نام کے بل بوتے پر اونچے دام حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ ہماری قوم کی جو حالت ہے اس کے پیش نظر بے جان دلاسوں، خوش فہمیوں اور ایسے علوم کی ضرورت نہیں جو اسے پستی میں لے جائے۔''

''علم کی کوئی انتہا نہیں، ابھی اردو ادب کو ترقی کی بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔ اردو ادب میں تحقیق کی طرف خصوصاً نوجوان نسل کا رجحان کافی کم ہے۔ اس لیے یہ زبان روز بروز زوال کا شکار ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ شاید انگریزی کی طرف زیادہ رجحان ہو سکتا ہے۔ اگرچہ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے، ہمارا تعلق ترقی پذیر ملک سے ہے بلکہ ہم ترقی یافتہ ملکوں کے محتاج بن چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی طرف بھی پلٹ کر دیکھنا چاہیے۔ ہمیں دوسری زبانوں کی طرح جدید علوم کو ساتھ لے کر چلنا اور ایک محدود حصار سے باہر نکلنا چاہیے۔''

ابوالطاہر فدا حسین فدا 21 جون 1919ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ کلام موزوں کم عمری ہی میں زبان سے نکل جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ملکہ ترقی کرنے لگا۔ ذوق سخن بڑھتا گیا، چنانچہ پوری غزلیں لکھنے لگے اور باقاعدہ طور پر مومن ثانی علامہ تاج عرفانی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ڈرامہ میں بھی ان کے لیے ایک خاص کشش تھی اور یہی کشش انہیں کشاں کشاں کلکتہ لے گئی جہاں قریباً پانچ برس تک مقیم رہے اور شیکسپیئر ہند آغا حشر کاشمیری اور منشی نازاں جیسے صاحب کمال اساتذہ کے فیضان صحبت میں تحصیل علم و ادب کرتے رہے۔ کلکتہ میں انہوں نے مختلف ہفتہ وار اخبارات میں کام کیا۔ بالآخر حضرت جوہر غازی پوری کے اخبار ''عبرت'' سے منسلک ہو گئے اور جب تک کلکتہ میں رہے ''عبرت'' ترتیب دیتے

Scanned with CamScanner

رہے۔ان کا قصیدہ ''ماہِ صیام'' پہلی بار ''عبرت'' ہی میں شائع ہوا۔اب انہیں لاہور کی یاد ستانے لگی لہٰذا کلکتہ کو خیر باد کہا لیکن لکھنؤ میں رک گئے۔کوئی سال بھر یہاں قیام کیا اور کئی مشاعروں میں شریک ہوئے۔ان مشاعروں میں جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی، عبدالمجید سالک، صبا متھراوی، حفیظ جالندھری، احسان دانش اور دیگر اکابرین شرکت کیا کرتے تھے۔آخر کار لاہور پہنچ گئے اور لاہور ہی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ان کا زیادہ تر کلام ''مصور''، بمبئی، ''چونچ''، ''عبرت''، کلکتہ اور ''نگارستان'' دہلی میں چھپتا رہا۔لاہور میں ان کے اشعار مصور، ساگر، انصاری، چترا، لطف شباب، خیام، احسان، انقلاب، ماہنامہ پنجابی، غازی، موج نور اور مومن کے صفحات کی زینت بنے۔بعد ازاں یہ سلسلہ پاک جمہوریت، روزنامہ امروز، افکار و کردار، آئینہ قسمت، لیل و نہار، استقلال، چٹان اور نوائے وقت تک پھیلتا چلا گیا۔

ابوالطاہر فدا حسین فدا نے مختلف حیثیتوں سے اردو اور پنجابی کے لیے خدمات انجام دیں۔شاعری، تنقید، ڈرامہ، افسانہ، ناول، سوانح نگاری اور تحقیق ان کے معتبر حوالے ٹھہرے۔شاعری میں انہوں نے حمد، نعت، منقبت، سلام، غزل، نظم، رباعی اور قطعہ کی صورت میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ان کی اردو غزلوں پر مشتمل اولین مجموعہ ''افکارِ پریشاں'' پہلی بار 1948ء میں شائع ہوا۔اس کا پیش لفظ پرنسپل نیشنل کالج لاہور پروفیسر بشیر احمد صدیقی نے تحریر کیا۔ان کے الفاظ میں:

''فدا صاحب ابھی جوان ہیں اور ان کی شاعری بھی جوان ہے لیکن ان کے کلام میں ایک خاص طرح کی پختگی، بے ساختہ پن اور روانی ہے۔ اس پر اکثر و بیشتر اشعار سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔صنف غزل ان کا مرغوب موضوع ہے لیکن ان کی غزلیات میں بھی ایک عجیب ندرت ہے جو دوسرے غزل گو شاعروں سے انہیں الگ رکھتی ہے۔''

دیباچہ میں خواجہ دل محمد سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور نے لکھا۔

''ان کی شاعری کا میدان زیادہ تر حسن و عشق کا میدان ہے جو مجاز کی حد سے آگے نہیں بڑھا لیکن ان کا کلام ان کے سچے جذبات کا آئینہ دار ہے۔اس میں حسن مجاز کی جزئیات و تفصیلات ہیں مگر ایک مخصوص انداز میں، واردات و جذبات کی فراوانی ہے مگر ندرت و جدت کے ساتھ۔اس میں حکیمانہ حقائق و معارف بھی ہیں لیکن وجدان تعقل کے ماتحت۔''

واضح رہے کہ فدا صاحب کا ایک مجموعہ غزل ''ساغر و مینا'' اس سے پہلے 1946ء میں بھارت سے شائع ہو چکا تھا۔فدا صاحب کی تخلیقی شخصیت کا نمایاں ترین وصف فن تاریخ گوئی میں ابھر کر سامنے آیا۔اپنے اس فنی حوالے پر وہ بہت نازاں بھی تھے۔اس سلسلے میں ان کا مجموعہ ''معدن التواریخ'' ان کی زندگی میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ڈاکٹر وحید قریشی نے ''معدن التواریخ'' کو عصر حاضر کی نامور شخصیات کے حالات و واقعات کا گلدستہ ہی نہیں بلکہ فدا صاحب کے اعجاز فن کا محکم نمونہ قرار دیا۔

قیام پاکستان کے بعد نعت گوئی کا مقدس فن باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔اس عرصہ میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے نعت رسول مقبول ﷺ کہنے کی سعادت حاصل نہ کی ہو۔فدا صاحب نے نہ صرف یہ کہ نعت کہی بلکہ جب اس مبارک صنف سخن کی طرف آئے تو غزل گوئی تقریباً ترک کر دی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو مدح ممدوح دو عالمؐ کے لیے وقف کر دیا۔ان کا نعتیہ مجموعہ ''خمستان

Scanned with CamScanner

سرمدی'' جدید اردو نعت کی روایت میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے کے حوالے سے سردار علی احمد خان کی رائے ملاحظہ کیجئے۔

''ابوالطاہر فدا حسین فدا بستان محمدیؐ کے ایک بلبل شوریدہ سر ہیں، ان کی نعتوں میں ایک مخصوص نغمگی ہے جو قاری کے حریم روح میں شمع ایمان کو منور کئے دیتی ہے۔ سرکار دو جہاں ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کی گئی یہ نعتیں بس یوں سمجھئے کہ سچے موتیوں کی لڑیاں ہیں جن میں مزین موزوں الفاظ ڈھلکتے اور چمکتے ہوئے لولوئے لالہ ہیں۔ فدا صاحب کا آہنگ شاد دیکھئے:

سائل انوار بن کر مہر و مہ صبح و مسا
در پہ آتے ہیں تمہارے باری باری واہ وا

.....

ان کی مدحت کا ہر اک لفظ ہے مشک و عنبر
جب پڑھی نعت تو اشعار سے خوشبو آئی
مصحف رخ ترا قرآن ہے اللہ اللہ
زینت ارض و سما شان ہے اللہ اللہ

.....

نگاہ رحم جو فرمائیں خستہ حال پہ آپ
گنہگار پہ دوزخ حرام ہو جائے
درِ رسولؐ پہ اسباب حاضری ہو جائیں
الٰہی! ایسا کوئی اہتمام ہو جائے
عرش اعلیٰ سے شہیدان وفا کو اب بھی
نطق محبوب مشیت کی صدا آتی ہے

.....

حریم خانہ کعبہ کی حرمت آپ کے دم سے
بہارِ بے خزاں ہو ابر رحمت کی گھٹا ہو تم

.....

Scanned with CamScanner

یہ میری خوش نصیبی ہے یہ فیاضی ہے قدرت کی
فدا اس جان رحمت پر دل و جاں سے فدا ہوں میں

.....

ہیں جنت فردوس کی رعنائیاں سب ہیچ
صد رشک چمن زار ہے ہر خارِ مدینہ

.....

کس نے بیواؤں، یتیموں پر کیا لطف و کرم
مفلسوں اور بے کسوں کو کس نے سیم و زر دیا

.....

مجھے یاد ہے ''مہر و ماہ'' میں ایک گوشہ پنجابی زبان کے لیے بھی مختص ہوتا تھا اور اس میں پنجابی زبان و ادب کے نمایاں شعرا و ادبا کی تخلیقات نظم و نثر شامل ہوا کرتی تھیں۔ یہ فدا صاحب کی اپنی ماں بولی سے دلی محبت کی منہ بولتی دلیل تھی۔ ویسے بھی فدا صاحب کے حلقۂ احباب میں اکثریت پنجابی لکھنے والوں کی تھی۔ بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؔ اور پیر فضل گجراتی کے ساتھ ان کے گھریلو تعلقات تھے۔ طاہر ابدال طاہر نے مجھے بتایا کہ دفتر ''مہر و ماہ'' پر گاہے ماہے شعری نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں جن میں پنجابی زبان و ادب کے یہ اکابرین برابر شریک ہوتے تھے۔ طاہر کی رسم بسم اللہ پر پیر فضل گجراتی کی نظم دیکھ کر مجھے ان کی قسمت پر رشک آیا۔ خود فدا صاحب نے بھی اپنی ماں بولی کو ذریعہ اظہار بنایا اور اردو کی طرح پنجابی میں بھی مختلف اصناف شعر میں طبع آزمائی کی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین طاہر ابدال طاہرؔ نے ان کی بکھری ہوئی پنجابی شعری تخلیقات کو یکجا کیا اور ''اکھاں ویکھن تیری راہ'' کے خوبصورت نام سے شائع کروایا جس پر موصوف اہل ادب کے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ فدا صاحب کی پنجابی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے لکھا۔

''ساڈے متر تے اردو پنجابی شاعراں وچوں نتارویں تے اچے شاعر فدا حسین فداؔ اجہے سوجھواناں چوں نیں جنہاں ادب دی راہ وچ تھاں تھاں اپنے خیالاں نوں میلاں دے پتھر وانگوں نویاں راہیاں لئی راہ دے نشان بنا دتا اے۔''

ڈاکٹر محمد باقر کی رائے دیکھیں۔

''پنجابی ادب دی جدوں وی تاریخ لکھی گئی اوہدے وچ ابوالطاہر فدا حسین فدا داناں بڑی عزت تے احترام نال لکھیا جائے گا۔''

فدا حسین فدا کی تخلیقی شخصیت کا ایک نمایاں وصف ان کی منقبت نگاری بھی ہے۔ اہل بیت اطہار، خلفائے راشدینؓ اور اولیائے کرامؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کا فن اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ سے تو وہ خصوصی عقیدت

ارادت رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے ان کے ساتھ جو آخری شام منائی گئی وہ ''ہجویری فاؤنڈیشن'' کے زیر اہتمام ہی تھی۔ جسٹس منیر احمد مغل کے زیر صدارت ہونے والی اس تقریب میں راقم کو بھی اظہار خیال کا شرف حاصل ہوا تھا۔ پھر فدا صاحب کی نماز جنازہ بھی داتا دربار کے احاطہ میں ادا کی گئی۔ سید علی ہجویریؒ کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے شہنشاہ ولایت ، قیصر فخر و غنا
سائل دربار ہے تیرا ہر اک شاہ و گدا
نور توحید و رسالت کی ہے اک قندیل تو
آفتاب چرخ ملت، پرتو رشد و ہدیٰ

.....

مصحف اسرار حق بے شک ہے روئے گنج بخش
مخزن علم لدنی گفتگوئے گنج بخش
سیرت اقدس ہے ان کی آئنہ شرع و دیں
مرأت فقر و غنا ہے خلق و خوئے گنج بخش
مہبط نور معارف ہے فدا قلب حضور
ہو نہ کیوں ہر اہل دل کو جستجوئے گنج بخش

فدا صاحب کی منقبت نگاری کے حوالے سے حضرت حفیظ تائب رقم طراز ہیں:

''عہد موجود میں منقبت نگاری کے باب میں مسلک اہل سنت کی متوازن مگر بھرپور نمائندگی کا شرف ابوالطاہر فدا حسین فدا کو حاصل ہوا ہے جنہوں نے حبیب مصطفیٰ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، ابوبکرؓ و عمرؓ، جلال فاروق، تصور فاروق اعظم، ذوالنورین، خیبر شکن، چہار یار، مہمان کربلا، تعمیر حیات (مدح شہدائے کرام)، شہید کربلا، شمع صداقت (حضرت امام حسینؓ)، حضرت امام ربانیؒ، مجدد الف ثانیؒ، حضرت علی ہجویریؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، امام ابوحنیفہؒ، علی مخدوم ہجویریؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ، حضرت شیخ عبدالجلیلؒ چوہڑ بندگی اور بابا سید رسولؒ قریشی ہاشمی کے عنوانات سے مناقب لکھ کر بے پناہ فنی مہارت، بے کراں عقیدت اور فکری توازن کا اظہار کیا ہے۔''

جہاں تک فدا صاحب کے نثری کارناموں کا تعلق ہے ان کی تفصیلات بھی حیرت انگیز مسرت اور مسرت انگیز حیرتوں کے در وا کر دیتی ہے۔ ان کا ناول ''سنہری راز'' 1945ء میں منصۂ شہود پر آ ا۔ 1946ء میں ڈرامہ ''گناہواں دی پنڈ'' شائع ہوا۔ سوانح نگاری

Scanned with CamScanner

کے باب میں انہوں نے دو کتابیں ''تحفہ سلطانیہ'' (حضرت سلطان باہوؒ) اور ''آفتاب تصوف'' (حضرت باوا سید رسولؒ قریشی ہاشمی) لکھیں۔تنقید کے ضمن میں آفتاب تاج (تاج عرفانی کا فکر وفن) اور جہاد سخن (مضامین) شائع ہوئیں۔تنقیدی مضامین کی دو اور کتابیں ''شعلۂ انتقام'' دو جلدیں ''پاداش'' دو جلدیں منظر عام پر آئیں۔''مہر و ماہ'' کے پچاس سالہ اداریے اگر مدون ہو جائیں تو یہ الگ سے ایک کتاب بن سکتی ہے۔اس جریدہ کے نامی نمبر، تاج عرفانی نمبر، اذکار فضل، یادگار فضل، داستان فقیر، یادگار فقیر اور یادگار حکیم موسیٰ نمبر بھی حوالے کی چیزیں ہیں۔فدا صاحب کی تحقیقی کتب میں ''ہیر تاج عرفانی'' اور ''کلیات خوش طبع'' شامل ہیں۔''سخن گسترانہ'' کے نام سے انہوں نے اساتذہ اور اپنے ہم عصر شعراً کی زمینوں میں کہی گئی اپنی غزلوں کی کتاب بھی ترتیب دی جو ہنوز منظر اشاعت ہے۔ ''رباعیات فدا''، ''مناقب'' کے علاوہ تاریخ گوئی کے حوالے سے دو شعری مجموعے ابھی منظر عام پر آنا ہیں۔قومی نظموں پر مشتمل کتاب ''نغمہ و شمشیر'' اور ڈرامہ ''زود پشیماں'' بھی برادرم طاہر ابدال طاہر کی توجہ کی طالب ہیں۔

ابوالطاہر فدا حسین فدا کا علمی و ادبی سفر تقریباً پون صدی پر محیط ہے۔100 کے قریب ادباء، شعراء اور مشاہیر کرام نے ان کی حیات ہی میں ان کی خدمات کے اعتراف میں مقالات و منظومات تحریر کئے۔جن کا انتخاب 1999ء میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے زیر ادارت تذکار فدا کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔2004ء میں پروفیسر طلعت رشید نے ڈاکٹر محمد سلیم ملک کے زیر نگرانی ''فدا حسین فدا.....فن اور شخصیت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا جو 270 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کامیاب سعی پر مقالہ نگار کو پنجاب یونیورسٹی نے ایم فل کی ڈگری سے نوازا۔

ابوالطاہر فدا حسین فدا کی غزلوں کا تازہ مجموعہ ''ہمیں تلاش نہ کر'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔غزل ہمیشہ فدا صاحب کی محبوب و مرغوب صنف سخن رہی ہے۔ان کی غزلوں نے ہی انہیں اساتذہ کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کا اعتماد بخشا۔''ہمیں تلاش نہ کر'' میں ''افکار پریشاں'' کے بعد کی غزلیں شامل ہیں جو انہوں نے نعت گوئی اور تاریخ نگاری کے شانہ بشانہ تخلیق کیں۔ان کی غزل کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی نے لکھا۔''ابوالطاہر فدا حسین فدا کے کلام کے مطالعے کے بعد میرا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ وہ قادر الکلام شاعر ہیں اور جب وہ کسی خیال یا جذبے کو شعر میں منتقل کرتے ہیں تو تکلف یا تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ان کا کلام موضوعات کے لحاظ سے متنوع ہے، چنانچہ قاری مطالعے کے کسی بھی مرحلے پر اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔وہ اپنی شاعری میں دریا کی طرح رواں دواں رہے ہیں۔''

پروفیسر جیلانی کامران نے ان الفاظ میں اپنی رائے دی۔

''فدا حسین فدا کی شاعری میں روایت اور جدت کا رنگ جھلملاتا ہے اور ایسی طبیعت دکھائی دیتی ہے جو ذاتی موضوعات کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرنے پر قادر ہے۔ان کے طرز بیان اور الفاظ کی نشست و برخاست میں ایک خاص ادا ہے جو ہماری شعریت میں کلام کی جمالیات کو نمایاں کرتی ہے۔ہمارے عہد میں جب شعرا روایت سے انحراف کرتے

Scanned with CamScanner

ہوئے نئے زاویوں کی تلاش میں مصروف ہیں ایسے میں فدا کا کلام ہمیں اپنی روایت کی پاسداری کا احساس دلاتا ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ ہمارے عہد کو وہ باتیں یاد دلاتا رہے گا جو اس نے بھلا رکھی ہیں۔''

''ہمیں تلاش نہ کر'' کا مطالعہ خود میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ ٹھہرا۔ ان کے کلام کی پختگی اور استادانہ آہنگ نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ میں زندگی میں اگر فدا صاحب سے نہ بھی ملا ہوتا تو بھی ان کی غزلوں کے مختلف اور متنوع زاویے مجھے ان کی شخصیت کے ہر ہر پہلو سے آشنا کرانے کے لیے کافی تھے۔ حضرت فدا کے فن کا جادو ان کی تشبیہات، استعارات اور تراکیب میں سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میرے سامنے ''ہمیں تلاش نہ کر'' کے اوراق بکھرے پڑے ہیں اور میں ان کے مطالعے سے اپنے ذوق کی تسکین کا مکمل سامان کر رہا ہوں.....

جاں بکف آج فدا چلیے بصد شوق وہاں
حق جہاں دار و رسن ، عشق جہاں سولی ہے

ہر ایک چیز ملی دل کا مدعا نہ ملا
ترے سوا مجھے دنیا میں اور کیا نہ ملا

.....

کس کی الفت کا فدا دل پہ اٹھائے ہوئے بار
منزل عشق کے مزدور چلے جاتے ہیں

.....

نگاہ مادرِ گیتی ہمیں تلاش نہ کر
غریب شہر ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

.....

افکار میں شیریں سخنی کرتا ہوں
حرفوں کو عقیق یمنی کرتا ہوں

بن جاتے ہیں یاقوت و زمرد اعراب
ہر نقطے کو ہیرے کی کنی کرتا ہوں

.....

☆☆.....☆☆☆.....☆☆

Scanned with CamScanner

سید مشکور حسین یاد

غزل

بھلا ہم کب کسی کو ڈھونڈتے ہیں
ہم اپنے آپ ہی کو ڈھونڈتے ہیں
قرارِ واقعی مل جائے شاید
قرارِ واقعی کو ڈھونڈتے ہیں
ہوس کو ہم کہاں کرتے ہیں رخصت
ہوس کی واپسی کو ڈھونڈتے ہیں
بہت ہم روشنی کرتے ہیں پھر بھی
بہت ہم روشنی کو ڈھونڈتے ہیں
سمجھتے خود کو کیا ہیں چاند سورج
ستارے تیرگی کو ڈھونڈتے ہیں
مچاتے ہیں بہت جو شور مشکورؔ
وہی تو خامشی کو ڈھونڈتے ہیں

ناصر زیدی

غزل

وہ رعبِ حسن تھا اس کا، سلام بھول گیا
کرا سکا نہ تعارف، میں نام بھول گیا
اِدھر اُدھر کی ہوئی خوب گفتگو اس سے
بہت ضروری تھا لیکن جو کام، بھول گیا
غمِ جہاں نے کیا اس قدر خراب کہ، میں
جو دوستوں میں گزرتی تھی شام، بھول گیا
زبانِ غیر سے میں تیرا تذکرہ سن کر
ذرا سی دیر میں سب احترام، بھول گیا
رکھا جو اس نے محبت سے ہاتھ کاندھے پر
جو دل میں درد تھا میرے، تمام بھول گیا
یہ کیسی راہِ تمنا تھی میرے پیشِ نظر
چلا تو چل کے فقط چند گام، بھول گیا
میں اس کی ذات میں گم اس طرح ہوا ناصرؔ
کہاں کے ہوش و خرد، سب کلام بھول گیا

Scanned with CamScanner

شفیق سلیمی

غزل

دل میں سرشاریاں رہی ہیں
لب پہ کِلکاریاں رہی ہیں
زخم تن پر سجے رہے ہیں
کیسی گلکاریاں رہی ہیں
عشق کے ساتھ ساتھ دل کو
کتنی بیماریاں رہی ہیں
آنکھ پیڑوں پہ جا ٹکی تھی
ہاتھ میں آریاں رہی ہیں
بارش اس ذات کی تھی شب بھر
خوب میخواریاں رہی ہیں

ظفرالحق چشتی

غزل

کچھ طرزِ سکوتِ صفتِ بحر بدل بھی
اے دل میرے پہلو میں اگر ہے تو مچل بھی
ہے خشک بہت صحنِ بیابانِ تمنا
اے دجلۂ دل اب میری آنکھیں سے نکل بھی
فریاد عنادل کی سُنے کون چمن میں
اُس گل کے طرف دار ہیں نرگس بھی کنول بھی
کب تک شہر آشوبِ فغانِ غدرِ دل
اِن اُجڑے مکانوں میں کوئی شامِ غزل بھی
ہستی ہے پریشاں ترے بسمل کی تڑپ پر
حیران کھڑی دیکھتی جاتی ہے اجل بھی
جس سمت نظر ڈالیے اِک آگ لگی ہے
اے جانِ حزیں دیر ہے کیا تو کہیں جل بھی
اِس خاک کے مامور ہیں سورج بھی قمر بھی
اِس خاک کے سائے میں ابد بھی ہے ازل بھی
ہیں آج بھی دربار میں سب شیخ و برہمن
تنہا سرِمنصور سرِدار تھا کل بھی
تسلیم ظفر جو ہر گفتار کی لذت
اے نکتہ ورِ فکرو نظر حسنِ عمل بھی

Scanned with CamScanner

محمد علی ظاہر

غزل

یاد کو اُس کی جو سینے سے لگایا ہوا ہے
اِسی تعویذ نے ہر غم سے بچایا ہوا ہے
جس کو جانا ہو ہمیں چھوڑ کے جا سکتا ہے
ہم نے شب ہی سے چراغوں کو بجھایا ہوا ہے
میں اگر اُس کو بھلا دوں تو میں کافر ہو جاؤں
یار کا شکر ہے ایمان بچایا ہوا ہے
تُو جسے دانتوں تلے اپنے لیے پھرتا ہے!
یارا! یہ لقمہ تو پہلے سے چبایا ہوا ہے
آج کی رات بہت خوب کٹے گی ظاہر
آج وہ شخص مرے خواب میں آیا ہوا ہے

☆.....☆☆☆.....☆

محمد علی ظاہر

غزل

بھٹکتا کیوں ہے بونہی در بدر ، محبت کر!
دیارِ یار کے دریوزہ گر ، محبت کر!
یہی ہے نسخہء اکسیر ہر مرض کے لیے
ہوس کے دام سے بچنا ہے گر ، محبت کر!
کسی کے ہجر کی آتش میں کود جا بے خوف
کسی کی یاد میں جل جل کے مر ، محبت کر!
یہ کیا کہ روز ہی جینے کی اک نئی خواہش
بس ایک بار ہی ہو جا امر ، محبت کر!
کچھ اس طرح سے محبت نبھائی ہے میں نے
کہ یار کہتا ہے بارِ دگر محبت کر
بھڑک رہی ہے شبِ وصل کی ہری آتش
نگارِ سرخ! اب اِس میں اتر ، محبت کر!
ابھی تو تجھ کو ہوس بھی نہیں ہوئی پیارے
ابھی وہ کیوں کہے اے بے ہنر محبت کر!
بچھڑتے وقت وہ کہتا رہا علی ظاہر
وصال نہ بھی دے مجھ کو مگر محبت کر!

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

پروفیسر فرخ محمود

غزل

خیال و خواب کا ایسا سماں بناتے ہیں
کبھی یقیں تو کبھی ہم گماں بناتے ہیں

ہمیشہ انکے لئے خاک چھانتی ہے زمیں
جو روشنی کے نئے آسماں بناتے ہیں

تمہارے آنے سے کھلتے ہیں پھول صحرا میں
تمہارے نقشِ قدم گلستاں بناتے ہیں

وہ خود بھی تنکوں کی صورت بکھرنے لگتے ہیں
جو تنکے تنکے سے اک آشیاں بناتے ہیں

سخن وری میں وہی لوگ زندہ رہتے ہیں
نئے سخن میں جو طرزِ بیاں بناتے ہیں

☆☆☆☆☆

مرتضیٰ ساجد

غزل

سانسوں نے انتظار کا زیور پہن لیا
آنکھوں نے تیرے ہجر کا منظر پہن لیا

اے زندگی بتا ترا منشور اب ہے کیا
ہم نے تو ایک دوسرے کا ڈر پہن لیا

محور کے گرد گھومتی اندھی زمین کا
فطرت نے جو دیا وہی تیور پہن لیا

دل تیری جستجو میں رہے عمر بھر مگن
تیرا خیال اس لیے اکثر پہن لیا

ان منظروں سے دور کہیں جابسا ہے تو
میں نے مسافرت کا سمندر پہن لیا

مشکل تھا تجھ کو بھول کر جیون گزارنا
پھر بھی لباس ہجر یہ بہتر پہن لیا

جیسا تھا وہ کہاں ہے کوئی صاحب کمال
دیکھو تو ہر کسی نے قلندر پہن لیا

تیری رضا سمجھ لیا ہے تیرا فیصلہ
جیون نے جو دیا اُسے یکسر پہن لیا

تم تو بڑے حسین تھے یہ تم کو کیا ہوا
چہرے پہ کیوں یہ وقت کا زیور پہن لیا

خود سے لپٹ کے رو دیئے یا مسکرا دیئے
جھوٹی تسلیوں کو بدن پر پہن لیا

دیکھا ہے آئینے میں نیا خوف جاگتا
کیا پھر طلوع صبح نے ہے شر پہن لیا

دیتی ہے اب یہ چہرہ شناسی تو اضطراب
ساجد یہ کرب مفت میں لے کر پہن لیا

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

''ن م راشد کی نظموں کے انگریزی تراجم'' پر ایک ناقدانہ نظر

ڈاکٹر محمد نوید ازہر

ترجمہ کا فن دنیا بھر میں مشکل ترین فنون میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مخصوص تہذیبی و ثقافتی ورثے کی امین ہوتی ہے۔ کسی دوسری زبان سے کسی ادبی فن پارے کا ترجمہ کرتے ہوئے نہ تو تخلیق کار کے جذبات و احساسات کی کامل ترین ترجمانی ممکن ہے اور نہ ہی اس زبان کی تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی۔ پھر مترجم کا علمی مقام و مرتبہ بھی مصنف کے قریب قریب ہونا ضروری ہے تاکہ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے تحت مصنف کے دل کی بات ترجمہ پڑھنے والے کے دل پر وارد ہو۔ یوں ترجمہ محض ترجمہ نظر آنے کی بجائے بذاتِ خود مستقل تصنیف معلوم ہو۔ یہ کام خاصا مشکل ہے۔ شاید اسی لیے عربی میں کہا گیا ہے کہ مَنْ تَرْجَمَ یُتَرْجَمَ یعنی جس نے ترجمہ کیا، وہ سنگ سار ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ترجمہ ایک بے کار کوشش کے مترادف ہے۔ اکثر اوقات کسی ادبی فن پارے کا ایک اچھا ترجمہ ہمیں اس ماحول کے قریب قریب لے جاتا ہے جس میں مصنف نے اپنے شعور کی آنکھ کھولی ہو۔ ادبی فن پارہ جتنا اعلیٰ سطح کا ہو، ترجمہ اتنا ہی دقت طلب ہوگا۔ اس کے باوجود اردو ادب میں دیگر زبانوں کے ادب کی طرح شاعری اور نثر دونوں شعبوں میں کامیاب تراجم کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہے۔

''ن م راشد کی نظموں کے انگریزی تراجم'' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کی تدوین راشد کی ۴۷ نمایندہ نظموں کے تراجم کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ مدوّنہ کتاب دراصل پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے انھیں تفویض کیے گئے ایک تحقیقی منصوبے کی مطبوعہ کتابی شکل ہے، جسے مثال پبلشرز، فیصل آباد نے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ جس طرح ن م راشد کا نام جدید نظم گو شعراء میں سرفہرست ہے، اسی طرح ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کا مقام راشد شناسی کے حوالے سے فوقیت اور اولیت کا حامل ہے۔ انھوں نے راشد پر اس وقت اپنی

Scanned with CamScanner

تحقیقات کا آغاز کیا اور اس پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا جب اس کی نظموں کو نا قابل تفہیم اور مبہم سمجھ کر بہ حیثیت شاعر راشد کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ زیرِ نظر کتاب راشد کے موضوع پر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کی کتاب ہے۔ کتاب پر رائے زنی کرتے ہوئے شاعرِ نغز گو پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی اپنے اسلوبِ خاص میں رقم طراز ہیں:

''پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری ایک صاحبِ دل و نظر استاد، ادیب، شاعر اور پختہ تنقیدی و تجزیاتی استعداد رکھنے والے غیر معمولی محقق ہیں۔ ان کے احاطۂ تخصص کی متنوع جہات میں ایک فروزاں جہت راشد شناسی کی بھی ہے اور اس دائرۂ خاص میں ان کی تا حال سامنے آنے والی کاوشیں اتنی ارزشمند ہیں کہ راشد شناسی کے کٹھن مرحلوں میں بجا طور پر سمت نما کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی زیرِ نظر کتاب بھی مطالعاتِ راشد کے قابلِ ذکر ذخیرے میں بے حد سزاوارِ ستائش اضافہ ہے''۔

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کی شخصیت جتنی دل آویز ہے، اتنی ہی اس کتاب کی تدوین و ترتیب دل کش ہے اور اس کا اندازہ کتاب کا دیدہ زیب سرورق دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ راشد کی نظموں کے تراجم عربی، فارسی، جاپانی اور انگریزی میں ہوئے ہیں تاہم سب سے زیادہ تراجم کی تعداد انگریزی میں ہے۔ یہ تراجم خود راشد نے بھی کیے ہیں اور دیگر لوگوں نے بھی۔ بعض تراجم مشترکہ محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ کچھ تراجم اہلِ زبان نے کیے ہیں اور کچھ مستشرقین نے۔ بعض تراجم مترجمین نے کتابی صورت میں شائع کیے ہیں اور بعض رسائل و جرائد میں منتشر ہیں اور بعض ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کی شکل میں یہ تمام تراجم ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں ایک سیر حاصل مقدمہ تحریر کیا گیا ہے جس میں فنِ ترجمہ، راشد کی نظموں کے تراجم کی ادبی تاریخ، مترجمین کی مکمل فہرست، کمیت و کیفیت کے لحاظ سے تراجم کا تجزیہ مع حوالہ جات و حواشی تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ راشد کی چاروں کتابوں [ماورا، ایران میں اجنبی، لا یہ انسان، گماں کا ممکن] کے تراجم کو نظموں کے متون کے ساتھ الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مزید ایک باب میں دیگر منظومات اور ان کے تراجم کو شامل کیا گیا ہے، جس میں راشد کے متروک اور غیر مدوّن کلام میں سے تین نظموں کے تراجم دستیاب ہو سکے ہیں۔ کتاب کے آخر میں تحقیقی مقالہ کی طرح ''محاکمہ'' بھی شامل کیا گیا ہے۔

ہر باب کے آغاز میں ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے باب میں شامل نظموں اور ترجموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح ہر باب کے آخر میں حوالہ جات اور حواشی کا اندراج کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل کئی نظمیں ایسی ہیں جن کے ایک سے زیادہ تراجم تحقیق کے بعد دستیاب ہوئے ہیں اور وہ سب کے سب شاملِ کتاب کر دیے گئے ہیں۔ کتاب میں شامل چاروں ابواب میں موجود نظموں کا شماریاتی تناسب بھی مقدمہ میں درج ہے۔ بعض وہ تراجم جو ایک سے زیادہ مقامات پر شائع ہوئے ہیں ان کے سلسلے میں اولین اشاعت کو شاملِ کتاب کر کے دیگر دستیاب اشاعتوں کا ذکر متعلقہ ابواب کے حواشی میں کر دیا گیا ہے۔ ان تمام تراجم کے اندراج میں زمانی ترتیب کو

Scanned with CamScanner

اہمیت دی گئی ہے۔اس طرح اس کتاب میں کل ۱۳۱ تراجم شامل ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت سے ایک طرف راشد جیسے قابل توجہ اور رجحان ساز شاعر کی شاعرانہ عظمت میں اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری طرف اس کی معنی خیز نظموں کو انگریزی زبان میں حاصل ہونے والی پذیرائی سامنے آ رہی ہے۔ساتھ ہی ساتھ راشد کی نظموں کی تفہیم کا دائرہ پہلے سے وسیع ہوتا نظر آ رہا ہے۔یہ کتاب نہ صرف راشد کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک انداز ہے بلکہ تفہیم راشد کے سلسلے کو آگے بڑھانے کا ایک بہانہ بھی ہے۔وہ حضرات جو فارسی اور عربی زبانوں کی مبادیات سے ناواقف ہونے کے باعث راشد کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں، ان انگریزی تراجم کی مدد سے راشد کی نظموں کو نسبتاً بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔

کتاب کے ''اختتامیہ'' میں ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے فاضل مدوّن کی محنتِ شاقہ پر مبنی کتاب کے محاسن پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی چھے خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ فارسی آمیز جدید اردو شاعری کی تفہیم و تشریح پر عالمانہ دسترس

۲۔ انگریزی زبان و ادب سے قابل توجہ حد تک واقفیت

۳۔ راشد کی شاعری کے انگریزی تراجم کا کھوج لگانے اور انھیں ڈھونڈ نکالنے میں بھرپور استقلال

۴۔ ادبی تراجم کے فن، روایت اور اس کی اہمیت جیسے اہم موضوع کے قدیم و جدید مآخذ و منابع پر گہری نظر

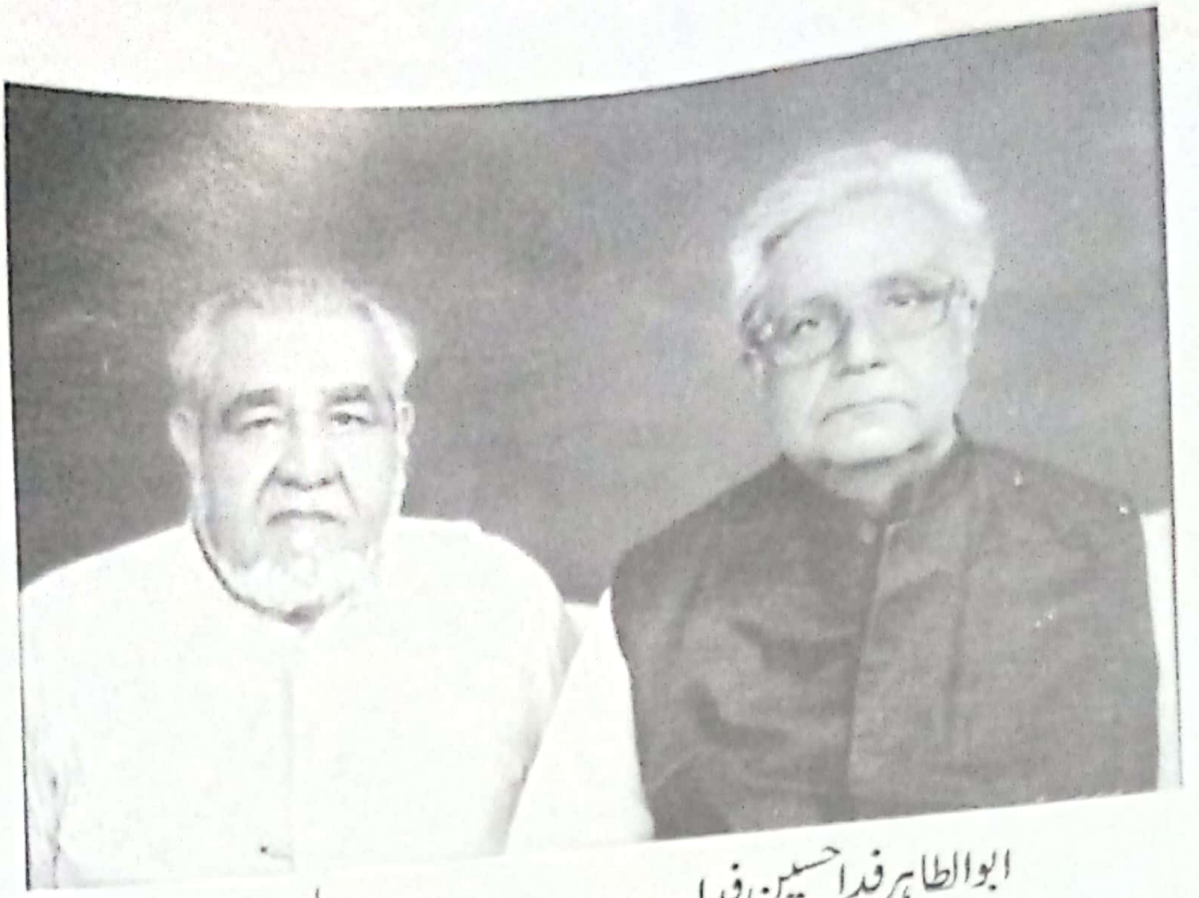
۵۔ تراجم کا حسنِ تدوین و ترتیب

۶۔ مقدمہ میں تحقیق و تنقید کا خوبصورت امتزاج

کتاب کی نثر نہایت سادہ، دل نشین اور تکلف سے عاری ہے۔نیز املا کے ضمن میں رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر کی پیروی کی گئی ہے۔تدوین، سلیقہ اور قرینہ دیکھ کر بے ساختہ منہ سے تحسین و آفرین کے کلمات نکل جاتے ہیں۔یوں اس کتاب کو اردو ادب کے نوآموز محققین کے سامنے ایک نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔بلاشبہ فاضل مدوّن نے معلومات کی جمع آوری، استخراجِ نتائج اور حسنِ اسلوب پر مبنی محاکمات کی دیوی تک پہنچنے کے لیے کوہِ قاف کی ہزاروں رکاوٹیں عبور کی ہیں اور تحقیق کی وادیِ پر خار میں اپنے پیچھے آنے والے آبلہ پاؤں کے لیے ایک مثال قائم کر دی ہے۔

☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner



ابوالطاہر فدا حسین فدا

سردار علی احمد خان



سرفراز احمد راہی

ابوالطاہر فدا حسین فدا

طاہر عبدل طاہر

Scanned with CamScanner



عمران منظور، محمد حنیف، گلزار، خالد احمد



قائم نقوی، ڈاکٹر اسد اریب، ماہ طلعت زاہدی، پروین ملک

Scanned with CamScanner